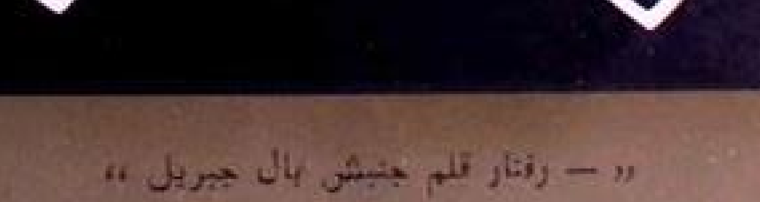
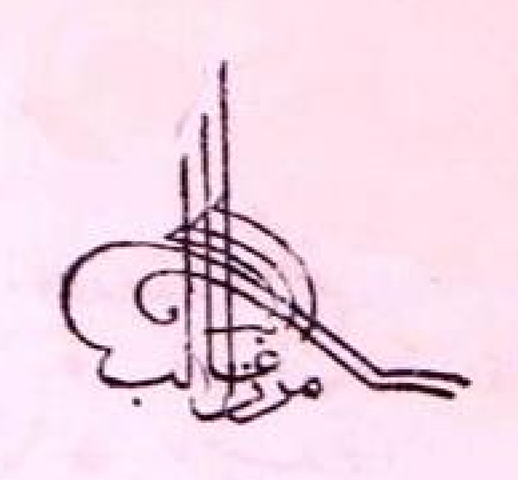


فروری ۱۹۶۲ء



خطاط : منشی عبدالمجید دہلوی

" — رفتار قلم جنبش بال جبریل "



جلد ۱۷ شمارہ ۲



غالب نمبر

مدیر: ظفر قریشی فروری ۱۹۶۴ء

تو کہے بت خانۂ آذر کھلا

سازہا مستِ طرب

بارے غزلے فردے

غزل گرمی آید افسانہ گو

..... وَدر ساغر افگنم

بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

نقش و نگار : ر ۔ خ

تختیں: (سرورق) : مہرنیمروز : تیرہ تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا!

واپسیں: تمثال کار: طاہر ۔ ایم ۔ سیّد

•

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

•

دریغا کہ لب ہائے ازکار ماند
سخن ہائے ناگفتہ بسیار ماند

سالانہ چندہ: ساڑھے پانچ روپے | شائع کردہ ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی | فی کاپی ۵۰ پیسہ

بزمِ قدح

رفیق خاور

حسبِ معمول یہ شمارہ غالب سے منسوب بلکہ کسی نہ کسی طرح، تمام وکمال اس ہی سے مخصوص ہے۔ پچھلے سال نہ صرف مواد بلکہ ترتیب، یہاں تک کہ متن و تصاویر کے عنوانات کو بھی ایک خاص انداز سے پیش کیا گیا تھا۔ تاکہ پیشکش اس عظیم مظہرِ فن کے شایانِ شان ہو جس سے یہ وابستہ ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ متاعِ ہنر کی دلپذیری" اپنے پہ کر رہا ہوں" قیاس ہی کی حد تک نہ رہی۔ اس لئے ہماری تمنّا تھی کہ اس سال متاعِ ہنر کو اور بھی دلپذیر بنایا جائے۔ یہ خواب کس طرح شرمندۂ تعبیر ہوا ہے، اس کا اندازہ اُن گلہائے رنگ رنگ سے کیا جا سکتا ہے جو اس شمارہ میں پیش کئے جا رہے ہیں:

حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں
گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

غالب نام آورم ہو یا دیگر مشاہیرِ فن، "ماہِ نو" کا طرۂ امتیاز یہ رہا ہے کہ حتی الامکان ان کے بارے میں تازہ ترین مواد — از شاخِ تازہ تر — اور ہر قسم کے مواد فراہم کرے۔ چنانچہ اس کے سابقہ شمارہ فروری میں گوناگوں قلمی شہ پارے، نقوش، غیر مطبوعہ خطوط و کلام اور تراجم وغیرہ پیش کئے جاتے رہے ہیں، ان میں مثنوی "ابرِ گہربار" کے منتخب حصّوں، ایک مرثیہ بہ شکل ترجیع بند اور غزل و نعت کے منظوم تراجم نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اور جن سے نہ صرف غالب کی شخصیت، اس کے دل و دماغ اور فکر و فن پر روشنی پڑتی ہے بلکہ اُس کے فارسی کلام سے بھی شناسائی ہوتی ہے اور اس کے نئے نئے غیر معروف پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ اس سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے اب بھی دیگر "ہر گونہ کالا" سے قطع نظر غالب کے اوّلین "تمثالِ شیریں" یعنی مجسمہ کا عکس "اس پر رگِ سنگ" کے زیرِ عنوان سیر حاصل تعارفی مضمون، ایک مثنوی "رنگ و بو" کا منثور ترجمہ، چار فارسی غزلیات کے منظوم تراجم اور ایک غزل کی پیروڈی، پیش کی جا رہی ہے۔ تاکہ بقول غالب "اندیشہ وارسد کہ دیوار رخ والائے سخن در چہ پایہ بلند است"۔ تراجم سے غالب کا فارسی کلام پہلی بار بعینہٖ اس کے اردو کلام کی طرح واضح اور مانوس پیرائے میں سامنے آجاتا ہے۔ اور ہم اس کی خصوصیات کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ جہاں تک گوناگوں برگ و ساماں — قلمی و تحریری — کو شایانِ شان اہتمام سے پیش کرنے کا تعلق ہے وہ پچھلے سال سے بوجوہ بلیغ تر ہے — جواہر طرف کلہ زیادہ افزوں بھی ہیں اور آبدار بھی۔ اور بعض آنکھوں ہی میں رہے گو ہر نہ بن سکے۔ انہی میں جناب نادم سیتاپوری کا فاضلانہ مضمون اور ہمارا اپنا مقالہ بھی تھا۔ مدیر اور نگراں کا کام خود کھیلنا نہیں بلکہ دوسروں کو کھیلنے کا موقع دینا ہے۔ اور پھر کھلاڑی بھی وہ جن کا پایہ مسلّم ہے۔ مولانا غلام رسول مہر، اکبر علی خاں، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید قدرت نقوی، اور وجاہت حسین سونی پتی وغیرہ حضرات گرامی۔ تمام روشناس ثوابت و سیّار۔

غالب کی شہرت اور قبولِ عام اب تک ایسی ایسی صورتیں اور مدارج اختیار کر چکے ہیں کہ ان کے بعد سوچنا پڑتا ہے ان میں توسیع و اضافہ کے مزید امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اسی سے ظاہر ہے کہ اس کی شہرت اب ہر قسم کی تنقید کی متحمل ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ ان کے سوانح حیات کی تحقیق سے بخوبی واضح ہے، اس کے خلاف زیادہ سے زیادہ حقائق بروئے کار آ چکے ہیں۔ تصنیفات نظم و نثر بھی معتدبہ فراہم ہو چکی ہیں۔ الّا ماشاء اللہ۔ اور ان سے جامع نتائج کا استنباط ممکن ہے۔ مزید دریافتوں سے کوئی نمایاں فرق پیدا ہونے کا چنداں قرینہ معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے اب سوال صرف اس کے فکر و فن کے زیادہ دقتِ نظر سے مطالعہ اور ان پر صحیح محاکمہ کا ہے۔ عالمی فکر و خیال کی راہیں جو روز بروز زیادہ واضح اور کشادہ ہوتی جاتی ہیں، ادب و فن کے جدید سے جدید تر نظریات، نقد و نظر کے نئے نئے پیمانے اور تحقیق کے روز افزوں دھارے، سب ویسے تقاضے پیش کرتے ہیں جن کے سامنے کلام، زیادہ تر اردو کلام، کی چند در چند شرحیں، مضامین و معانی اور نکات و معارف کی تشریح، خصوصیات نظم و نثر زیادہ تر صوری و معنوی محاسن کی توضیح کلاسیکی انداز میں یا پھر غیر معروضی تحسین، بسا اوقات محض توصیفی و غیر منطقی، یہاں تک کہ مبالغہ آمیزی، موشگافی اور نکتہ آفرینی کی حد تک پہنچی ہوئی۔ اور اس کے مماثل تنقیص بھی، قصّۂ پارینہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایسی استقرائی تنقید جو غالب کے

سرمایۂ نظم و نثر کے بالاستیعاب تطبیقی جائزہ اور مشرقی و مغربی مظاہرِ ادب و فن اور انتقادی نظریات کے تقابلی مطالعہ پر مبنی ہو، بڑی حد تک نایاب ہے۔

غزل ہو یا کوئی اور صنف، اس کے مطالعہ میں فیضان، ذوق، رجحان اور نفسِ شعر مقدم ہیں نہ کہ عمدہ اشعار کی تعداد یا صوری و معنوی محاسن کا شمار۔ اصل چیز تو "شمارِ دلبری" ہے۔ غالب کی متعدد اردو غزلیات اور اکثر فارسی غزلیات سے یہ نکتہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ دیکھنا ہے کہ شاعر کا تصور کیا ہے۔ کیا وہ محض غزل کہتا ہے کسی مقدم جذبے کے تحت نغمہ سرا ہوتا ہے۔ غالب نے یہ ضرور کہا ہے کہ "غالب بخود شیوۂ من قافیہ بندی" لیکن درحقیقت اس کا شیوہ دوسرے غزل گویوں سے مختلف نہیں۔ وہ بھی محض متفرق مضامین ہی قلمبند کرتا ہے۔ نہ وہ حقیقی معنوں میں عاشق ثابت ہوتا ہے نہ صوفی، نہ فلسفی، نہ رند، نہ امید پرست، نہ یاس پرست۔ اس کے اردو کلام سے یہ باتیں پھر بھی ثابت کی جا سکتی ہیں، فارسی کلام سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ محمد اکرام نے انہیں "حکیم فرزانہ" قرار دیا ہے اور بابائے اردو اس کے یہاں ایک نہیں کئی پیغام پاتے ہیں، جس کے معنی ہیں کوئی پیغام بھی نہیں! خود "حکیم فرزانہ" یا نفسیاتی کیفیتوں کا نباض ہونا بھی اس امر کا اعتراف ہے کہ اس کے یہاں کوئی بنیادی سرچشمۂ فیضان نہیں۔ چنانچہ نیاز فتحپوری نے صاف کہہ دیا ہے۔ کہ بیدل کی طرح وہ کسی عارفانہ احساس سے ناآشنا ہیں۔ اس سے قطع نظر کیا خود تصوف ایک منظم فلسفہ، ایک باقاعدہ، جامع زاویہ نگاہ نہیں؟ اگر غالب کے یہاں اس کی نشان دہی کی جا سکے تو پھر کوئی نظریہ یا پیغام نہ ہونا کیا معنی؟ اکثر نقاد غالب کا موازنہ اقبال سے کرتے ہیں جس کا ایک باقاعدہ فلسفہ ہے۔ اگر غالب میں اس قسم کا مربوط سلسلۂ فکر ہو اور اس کا اظہار رومی و اقبال ہی کے والہانہ انداز میں کیا گیا ہو تو پھر اس موازنہ کو کیسے بجا کہا جا سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ غالب اپنے اور اپنے حامیوں کے دعوے کے باوجود حقیقتہً ایک غزل گو شاعر ہے متفرق مضامین کو قلمبند کرنے والا شاعر، ایسے مضامین جو محض خیالی بھی ہوتے ہیں اور حقیقی بھی۔ غالب کے سلسلے میں جس طرح حقیقت اور افسانہ آمیز ہو گئے ہیں اس کی ایک پُرلطف مثال حالی اور دیگر ناقدین کی یہ رائے ہے کہ ان کے ہاں اجتہاد کا مادہ بدرجۂ اتم ہے۔ ممکن ہے یہ بات ایک حد تک درست بھی ہو۔ لیکن جس امر سے پیچیدگی پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ غالب کے بیشمار مضامین، استعارے، ترکیبیں وغیرہ جو بظاہر طبع زاد معلوم ہوتے ہیں، درحقیقت مستعار ہیں اور ان کی تعداد ساٹھ ستر فیصد کی حد تک پہنچتی ہے۔ گویا اس کی جدت غیر معمولی حد تک روایت ہی میں ڈوبی ہوئی ہے، چنانچہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ جدت کا زیادہ شاعر ہے یا روایت کا۔ ایک جدید نقاد نے اسلوب پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ جدت آمیز اسلوب کے لئے منفرد تجربہ لازم ہے اور اس نظریہ کی تائید میں غالب کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن اگر غالب کا مبدءِ فیضان منفرد تجربہ کی بجائے صدہا سال کی روایت ہو تو؟ بجنوری کو غالب کی جدت افتاں و خیزاں بحروں میں نظر آئی۔ لیکن کیا یہ بحریں صرف غالب ہی سے مخصوص ہیں؟ بجنوری نے برنگِ کاغذِ آتش زدہ میں کیا کیا باریکیاں تلاش ہیں اور ایسا کرتے ہوئے غالب کا سلسلہ انگلستان کے مابعد الطبیعیاتی شعراء سے جا ملایا ہے، جیسا کہ بعد میں شیخ اکرام نے بھی کیا ہے، مگر یہ تمام موشگافیاں اور خیال آرائیاں دیکھئے اور سندھی کے ایک فارسی گو شاعر کا یہ شعر بھی:

از بسکہ زسودائے غمِ ہجرِ تو داغم   چوں کاغذِ آتش زدہ نیرنگ چراغم

یا پھر ایک پنجابی شاعر کا یہ مصرع:— "آہ بر زد چو آتشِ خاموش"۔ ڈاکٹر سید عارف شاہ گیلانی نے قصیدوں پر قصیدے اور غزلوں پر غزلیں تلاش کی ہیں جن کی عمارت تہہ در تہہ روایات پر قائم ہے: "عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے"۔ اس میں بجنوری کی نکتہ آفرینی تسلیم، مگر کیا انہوں نے "مثنوی ابر گہربار" میں "خیال" کا حقیقی مفہوم بھی تلاش کرنے کی کوشش کی تھی؟ "جب کہ تجھ بن..." میں استفہام انکاری ہے نہ کہ وہ مہتم بالشان "شک" جس کی نشان دہی بجنوری نے کی ہے۔ اور یہ عقدہ بھی "مثنوی ابر گہربار"، کئی مثنویات، قصائد اور اشعار سے حل ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ غالب کے متعلق صحیح اخذِ نتائج اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس کے فارسی کلیات اور دیگر تصانیف نظم و نثر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے۔ غالب نے بیشک یہ کہا ہے کہ "فارسی بیں تا بہ بینی..." لیکن نہ وہ خود، نہ اس کے نقاد ہی ابھی تک محسوس کر سکے ہیں کہ دونوں میں کس قدر فرق ہے اور کن امور میں۔ خود اس کے کلام اردو کے متعلق ہمارے نتائج بڑی حد تک بے ربط یا تاثراتی ہیں۔ اس لئے کہ ہمارا طرزِ تنقید جداگانہ ہے۔ ہم ابھی تک غالب کے فکر و اسلوب میں وہ صورتِ خرابی کی نہیں دیکھ سکے جو اس قدر نمایاں اور بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا منتخب اردو کلام بھی میکانیت سے خالی نہیں۔ اس سے ہمارا مدعا عظمتِ غالب کی نفی یا تخفیف نہیں بلکہ تنقید کو صحیح معنوں میں تنقید بنانا ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ غالب کے بارے میں جو کچھ امکاناً کہا جا سکتا تھا، کہا جا چکا ہے۔ واقعی؟ شاید یہ سطور اس مغالطہ کو دور کرتے ہوئے نقدِ ادب کا نیا رجحان پیدا کرنے میں مدد دیں جو ہمارے ادبیات کی مزید نشوونما کے لئے اس قدر ضروری ہے۔

غالب کی شاعری

(غور و فکر کے بعض نئے پہلو)

شعرِ غالب نبود وحی و نگوئیم ولے
تو و یزداں نتواں گفت کہ الہامے ہست

غلام رسول مہر

مرزا غالب کی زندگی اور شاعری کے متعلق اتنی کتابیں، رسالے اور مقالے لکھے جا چکے ہیں کہ اردو اور فارسی کے شاعروں میں سے شاید ہی کسی کے ساتھ اتنا اعتنا کیا گیا ہو؛ ایک علامہ اقبال کو غالباً مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی مرزا کی شاعری کے بعض پہلو مزید غور و توجہ کے محتاج ہیں اور جس حد تک مجھے علم ہے ــــ بے تکلف اعتراف کر لینا چاہئے کہ وہ بہت محدود ہے ــــ کہہ سکتا ہوں کہ ان پہ اگر کچھ لکھا گیا ہے تو وہ بہت کم ہے۔

ان میں سے ایک پہلو کا ذکر میں نے "ماہِ نو" کے گزشتہ "غالب نمبر" میں سرسری طور پر کیا تھا۔ یعنی مرزا غالب کے جو شعر پیشتر کے اساتذہ سے استفادے یا "توارد" کے تحت آتے ہیں، ان کی چھان بین کی جائے اور جائزہ لیا جائے کہ آیا مرزا نے سابقہ مضامین میں کوئی خاص اضافہ کیا، جس سے ان کا حسن پوری طرح نکھر گیا؛ خواہ وہ اضافہ نفسِ مضمون میں ہو یا بیان میں۔ میں نے چند مثالیں بھی دی تھیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اصل معاملے کا دامن زیادہ وسیع ہے اور مرزا کے کلام سے شغف رکھنے والوں کی خدمت میں مؤدبانہ التماس ہے کہ وہ اس سلسلے میں غور و تحقیق کا قدم آگے بڑھائیں۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جو مضامین و مطالب کلیاتِ فارسی اور دیوانِ اردو دونوں میں موجود ہیں، ان کا موازنہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ کیا فارسی کے مضامین اردو میں یا اردو کے مضامین فارسی میں بعینہٖ لے لئے یا ان میں کچھ اضافہ کیا؛ ایک دوسرے کا ترجمہ ہے یا کسی ایک میں زیادہ وضاحت، زیادہ حسن اور زیادہ دل آویزی پیدا کر دی ہے؛ اس ضمن میں یہ اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اصل مضمون کے لئے فارسی کا قالب زیادہ موزوں رہا یا اردو کا؟

خود اردو میں بعض اشعار بہ لحاظِ نفسِ مضمون مترادف ہیں، اگرچہ اسلوبِ بیان ایک نہیں۔ ان پر الگ غور کرنا چاہئے۔ مثلاً:

۱۔ دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

۲۔ بقدرِ حسرتِ دل چاہئے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

یا

۱۔ وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

۲۔ قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

۳۔ لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

مرزا کی شاعری کے اس پہلو پر غور و تدبر یقینی منفعت بخش ہوگا۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مرزا کے بعض اشعار پر ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے ایسا تاثر قبول کر لیا گیا جو صحیح نہ تھا یا کم از کم اس کا دوسرا پہلو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ مثلاً مرزا کا ایک مشہور شعر ہے:

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

یہ شعر عموماً مرزا کی قنوطیت کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر مزید غور کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مرزا نے اس میں قنوطیت کا اظہار نہیں کیا، بلکہ ایک معاملے کے دو پہلو پیش کئے ہیں تاکہ اہلِ نظر دونوں کو سامنے رکھیں۔ ابر کے دامن میں وہ پانی بھی ہوتا ہے جو کھیتوں، فصلوں اور باغوں کے لئے آبِ حیات ہے، بجلی بھی ہوتی ہے، جو سب کچھ جلا کر راکھ بنا دیتی ہے۔ اسی طرح یہاں کی مختلف چیزوں کے دو ہی پہلو ہیں، جو متضاد نظر آتے ہیں۔ حقیقت شناس وہ ہے، جو دونوں پہلوؤں کو یکساں پیشِ نظر رکھے۔ نہ ابر کی آب رسانی کے جوشِ شادمانی میں بجلی کی تباہ کاری سے اعراض کرے اور نہ بجلی کی دہشت انگیزی سے ہراساں زدہ ہو کر ابر کے فیضان سے استفادے کا رشتہ کاٹ دے۔ اسے چاہئے کہ خیر سے فائدہ اٹھائے اور شر سے محفوظ رہنے کے لئے تمام ممکن تدبیروں پر عمل پیرا رہے۔

ہم کیوں سمجھیں کہ مرزا نے یہاں قنوطیت کا اظہار کیا ہے اور ان کی نظر اچھی چیزوں میں بھی بُرے پہلو ہی پر رہتی ہے؟ کیوں یہ نہ سمجھیں کہ انہوں نے دنیا کو بصیرت کی دعوت دی ہے؟ یعنی انسانوں کو صرف اچھے پہلو ہی پہ قانع نہ رہنا چاہئے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس اچھی چیز سے برائی ظہور کرے گی تو امید و رجائیت کی پوری متاع برباد ہو جائے گی۔ ضروری ہے کہ بُرا پہلو بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو تاکہ پہلے ہی اس کا انسداد کر لیا جائے۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مرزا نے "رشک" کی طرح بعض دوسرے مضامین میں بھی حیرت انگیز نکتہ آفرینیاں کی ہیں، مثلاً "شراب"۔ میرے اندازے کے مطابق "شراب" کے متعلق سیکڑوں شعر کہے۔ ہر شعر میں اس موضوع کے متعلق نئی بات کہی اور کوئی بھی بات ایسی نہ کہی جو اس دائرے میں حقیقت و واقعیت کی صحیح تصویر نہ ہو۔ مضامین شراب میں اتنا تنوع حافظ اور خیام کے ہاں بھی نہ ملے گا، جو خمریات میں امام مانے جاتے ہیں۔ ایسے مضامین بھی بے شمار ہیں، جن کے متعلق بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بعض اور پہلو بھی ہیں، لیکن میں اس گفتگو کو پھیلانا نہیں چاہتا اور جو کچھ اوپر پیش کر چکا ہوں، اس کی چند ملی جلی مثالیں عرض کروں گا۔

مرزا کا ایک فارسی شعر ہے:

تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود
خوش بود گر دانہ نبود دام را

پرندے پکڑنے کے لئے پھندا لگاتے ہیں تو اس پر دانے بکھیر دیتے ہیں تاکہ پرندے دانے کے لالچ میں درختوں سے زمین پر اتریں اور پھنس جائیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ دانے کی خاطر اترنا "تن پروری" ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ جال بچھاتے وقت اس پر دانے نہ بکھیرے جاتے تاکہ تن پروری کا ذوق پرندوں کے لئے گرفتاری کا موجب نہ ہوتا۔

یہی مضمون طاعت و عبادت کے سلسلے میں ذرا کھول کر بیان کیا تو فرمایا:

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

جو لوگ خدا کی عبادت کرتے ہیں، اس کے حکموں کے پابند رہتے ہیں، ان میں سے اکثر کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اعمالِ حسنہ کی جزا پائیں گے اور بہشت میں جائیں گے، جہاں شہد کی نہر بھی ہوگی، شرابِ طہور بھی ملے گی اور دوسری نعمتوں سے بھی مستفید ہوں گے۔ مرزا فرماتے ہیں کہ یہ طاعت خالصۃً خدا کے لئے نہ رہی بلکہ بہشت اور اس کی نعمتوں کے لئے ہو گئی۔ مرزا کے نزدیک حقیقی اور خالص طاعت وہ ہے، جو غیر اللہ کی تمام خواہشوں سے بالکل پاک ہو۔

پھر فرماتے ہیں:-

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

یعنی زہد اگر ریا سے پاک بھی ہو تو میں اس کا معتقد کیوں کر ہو سکتا ہوں۔ آخر اپنے اعمال کی جزا کا معاملہ تو ساتھ ساتھ چلا جا رہا ہے۔ جب تک اس طمعِ خام سے زہد پاک نہ ہو، وہ ایسا زہد کیوں کر بن سکتا ہے جسے میں قابلِ احترام مانوں؟

اب فارسی اور اردو کے متعدد ہم معنی اشعار پر ایک نظر ڈال لیجئے جنہیں میں نے سرسری نظر میں چنا ہے۔ دقتِ نظر سے کام لیا جائے تو اور بہت سے اشعار مل جائیں گے۔

۱- گریہ کرد از فریب و زارم کُشت
نگہ از تیغ آبدار تر است

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

۲- ہفت آسماں بہ گردش و ما در میانہ ایم
غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ مے رود

رات دن گردش میں ہیں ہفت آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

۳- ہر رشحہ بہ اندازۂ ہر حوصلہ دادند
مے خانۂ توفیق خم و جام نہ دارد

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

گرتی تھی ہم پہ برقِ تجلی، نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

۴- لالہ و گل دمد از طرفِ مزارش پسِ مرگ
تا چہا در دلِ غالب ہوسِ روئے تو بود

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

۵- رمز شناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد
محرم آن است کہ رہ جز بہ اشارت نہ رود

چاک مت کر جیب بے ایامِ گُل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہئے

۶- فغاں کہ نیست سر و برگ دامن افشانی
بہ بندِ خویش فرو ماندہ ام بہ عریانی

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

۷- ناکس ز تنومندی ظاہر نہ شود کس
چوں سنگِ سرِ رہ گران است و گراں نیست

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

۸- ناداں حریفِ مستیِ غالب مشو کہ او
دردی کش پیالۂ جمشید بودہ است

صاف دُردی کش پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

۹- از جوئے شیر و عشرتِ خسرو نشاں نہ ماند
غیرت ہنوز طعنہ بہ فرہاد می زند

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو، کیا خوب!
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

۱۰- فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار
نیست گر صبحِ بہارے، شبِ ماہے دریاب

غالب چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

مرزا کا ایک خاص مضمون یہ ہے کہ گناہوں کی پرسش میں انہیں اپنی حسرتیں یاد آجاتی ہیں۔ اس سلسلے میں فارسی کا ایک نہایت عمدہ شعر ہے:

اندر آں روز کہ پرسش رود از ہر چہ گزشت
کاش با ما سخن از حسرتِ ما نیز کنند

پھر یہی مضمون ایک رباعی میں یوں پیش کیا ہے:

اے آنکہ دہی مایہ کم و خواہش بیش
آں روز کہ وقت باز پرس آید پیش
بگزار مرا کہ من خیالے دارم
با حسرتِ عیشہائے ناکردۂ خویش

مثنوی "ابرِ گہر بار" کی مناجات کے آخر میں کم و بیش اسّی شعر صرف اسی موضوع پر کہے ہیں اور ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ وہ شعر پڑھتے وقت دل ہل جاتا ہے۔

دیوانِ اردو میں بھی دو شعر اس مضمون کے موجود ہیں:

۱- ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

۲- آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

آخر میں اتنا اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مختلف اصحاب نے مرزا کے بعض اردو اشعار کو کسی نہ کسی فارسی شعر کے ہم مطلب قرار دے لیا اور اس حقیقت پر غور نہ کیا کہ دونوں میں حقیقتہً کتنا فرق ہے۔ مثلاً بیگی دختر علی حیدر کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

من اگر توبہ ز مے کردہ ام اے سروِ سہی
تو خود ایں توبہ نہ کردی کہ مرا مے نہ دہی

یعنی اے سروِ سہی! اگر میں نے شراب سے توبہ کر لی تو تو نے کب توبہ کی تھی کہ مجھے شراب نہ دے گا؟ کہا گیا ہے کہ مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر اسی سے ماخوذ ہے:

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں؟
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا؟

بلاشبہ شراب سے توبہ کرنے اور ساقی کی طرف سے شراب نہ ملنے کا ذکر دونوں میں موجود ہے، مگر بیگی کا شعر محض ذکر پر ختم ہو گیا اور شراب کے سلسلے میں ساقی یا محبوب کو "سروِ سہی" کہنا کچھ لطف نہیں رکھتا۔ اور آپ مرزا کے شعر کی معنویت پر غور فرمائیے:

۱۔ "میں اور" سے ظاہر ہوتا ہے، میکش اتنا پینے والا ہے کہ ساقی اور رند سب اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اسی لئے "میں" پر خاص زور دیا اور صرف "میں" کہہ کر یہ پوری حقیقت واضح کر دی۔

۲۔ پھر شراب نہ ملنے سے جو تکلیف ہوئی، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ علاوہ بریں میکش کو اس بات پر بھی سخت غصہ ہے کہ عرق نوشی میں درجۂ کمال حاصل کر لینے کے باوصف ساقی نے قدر نہ پہچانی۔

۳۔ بے شک شراب سے توبہ کر لی تھی، مگر بزمِ مے میں جانے سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ توبہ کچھ ایسی پختہ و استوار نہیں کہ ٹوٹ نہ پائے یا شراب پیش کر دی جائے تو اسے قبول کرنے میں ہچکچاہٹ ہو۔

۴۔ "بزمِ مے" سے روشن ہے کہ شراب نہ ملنے کا واقعہ خلوت میں پیش نہ آیا، جسے طوعاً و کرہاً برداشت کیا جا سکتا تھا، بلکہ بھری محفل میں پیش آیا، جہاں حریفوں کا پورا گروہ موجود تھا۔ گویا سبکی اور بے عزتی رندوں کے مجمع میں ہوئی جس سے میکش کے غصے کی آگ برابر تیز ہو رہی ہے۔

۵۔ "یوں تشنہ کام آؤں" سے پتا چلتا ہے کہ رفعِ خمار کی بڑی امیدیں اور آرزوئیں لے کر بزمِ مے میں شریک ہوا تھا، مگر ساقی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور دور شروع ہوا تو اسے تشنہ کام و نامراد لوٹا دیا۔

۶۔ پھر کہتے ہیں اچھا بھئی مانا، میں نے توبہ کر لی تھی۔ آخر ساقی کو تو خیال ہونا چاہئے تھا کہ توبہ محض نمائشی اور ریائی ہے، کیونکہ وہ تو عمر بھر سے میکشی کو دیکھ رہا تھا، توبہ کا معاملہ تو ایک معمولی معاملہ تھا، یہ معمولی معاملہ یاد رکھا اور اسی کو معیارِ سلوک بنا لیا۔ عمر بھر کی ہم مشربی یک قلم فراموش کر دی۔

۷۔ سب سے آخر میں کہتے ہیں کہ "ساقی کو کیا ہوا تھا؟" یعنی میں نے توبہ کر لی تھی تو اس نے کیوں یہ ناقابلِ تصور روتیرہ اختیار کر لیا؟

پھر لطف یہ کہ کوئی معین بات نہیں بتاتے، "کیا ہوا تھا" کہہ کر معاملہ ختم کر دیا جس کی بیسیوں تعبیریں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً:

ا۔ کیا وہ اس پر ناراض تھا کہ میں نے توبہ کیوں کی؟

ب۔ کیا حریفوں نے اسے مختلف باتیں کہہ کہہ کر میرے خلاف برانگیختہ کر دیا تھا؟

ج۔ کیا وہ ہوش میں نہ تھا اور اس نے مجھے پہچانا نہیں تھا؟

د۔ کیا وہ چاہتا تھا کہ یوں مجھ سے بھری محفل میں توبہ کا بدلہ لے؟

ہ۔ کیا اس کے سے دیرینہ رند کے ساتھ ایسا برتاؤ مناسب تھا؟

و۔ یا کیا بیگی کے قول کے مطابق اس نے مجھے شراب دینے سے توبہ کر لی تھی؟

غرض سوچتے جائیے اور مختلف پہلو نکلتے آئیں گے، بیگی کے شعر میں معنویت کے اتنے پہلو کہاں موجود ہیں؟

غرض میری گزارشات کا مدعا یہ ہے کہ مرزا غالب کی شاعری کے ان پہلوؤں پر بھی اربابِ ذوق کو خاص توجہ فرمانی چاہئے اور مجھے یقین ہے کہ یہ توجہ بہر حال سود مند ہوگی، اغلب ہے کئی ایسے نکتے روشنی میں آ جائیں جو اب تک عام نظروں کی گرفت سے باہر رہے ہیں۔

★

"گنجینۂ گوہر کھلا"



کونسل پاکستان مسلم لیگ سے خطاب (ڈھاکہ)



وقت کی آواز ——— قوم سے نشری خطاب



ویسٹ وھارف، کراچی
(گودی میں توسیع و ترقی کا نقرئی ماڈل)



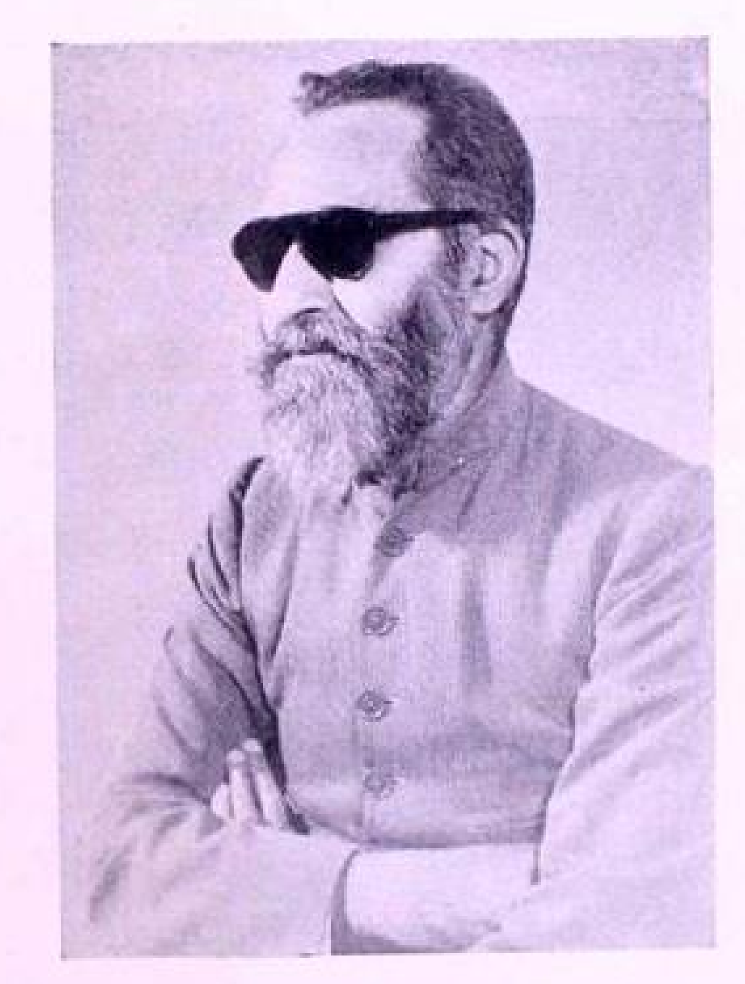
افریقہ و ایشیا کی
اقتصادی ترقی کانفرنس
(کراچی)

بزم چراغاں

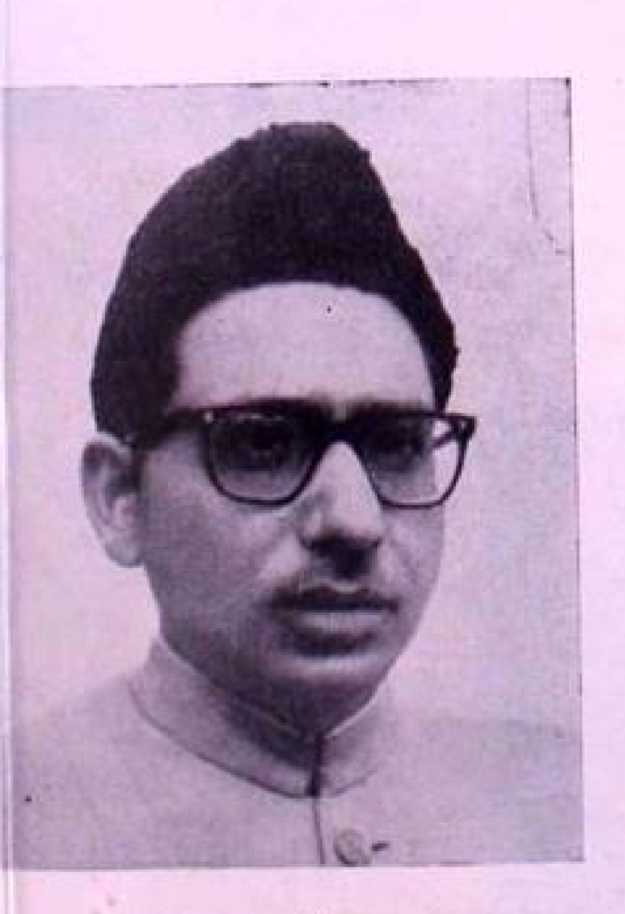


طاہر—ایم سید

وجاہت حسین سونی پتی



مولانا امتیاز علی خاں عرشی



منشی عبدالمجید دہلوی



سید قدرت نقوی

کلامِ غالب کا آفاقی پہلو

ڈاکٹر عبادت بریلوی

اس میں شبہ نہیں کہ شاعری شاعر کے ذاتی احساسات اور انفرادی تجربات کا آئینہ ہے۔ لیکن شاعر کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ اپنے ان ذاتی احساسات اور انفرادی تجربات میں عمومیت کا کچھ ایسا رنگ بھرتا ہے کہ وہ عام انسان کے احساسات اور تجربات کا روپ اختیار کر لیتے ہیں، اور اس طرح اس کا ہر تجربہ انسانی زندگی کی ایک عام حقیقت بن کر سامنے آتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے، اور ہر انفرادی خیال اور جذبے کا اطلاق عام اجتماعی اور انسانی خیال وجذبہ پر ہونے لگتا ہے۔ بڑا شاعر صرف اس کو جذبات و احساسات ہی تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ اس کو فکر سے ہم آہنگ کر کے انسانی زندگی کے فلسفیانہ حقائق کی تصویر بھی بنا دیتا ہے۔ یہی شاعری کا آفاقی پہلو ہے۔ اسی پہلو کی بدولت شاعری عظمت سے ہمکنار ہوتی ہے اور اس کا تخلیق کرنے والا عظیم شاعر کہلاتا ہے۔

غالب کی شاعری میں شروع سے آخر تک یہی صورتِ حال نظر آتی ہے۔ اس نے جن جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے اس میں ہر جگہ پر آفاقی پہلو اپنی جھلک دکھاتا ہے، بلکہ بعض اوقات تو اس کی شاعری میں ایسے مقامات آجاتے ہیں جہاں یہ آفاقیت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ شاعری میں آفاقیت کے اس عروج نے ہی اسے عظیم بنایا ہے۔ اسی کی بدولت غالب کے اشعار بے پناہ تاثر کے حامل بھی بن جاتے ہیں اور دلوں میں اتر کر روح پر ایک سرخوشی طاری کر دیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ انسان ان اشعار میں اپنے ہی جذبہ و احساس کی گونج پاتا ہے اور اپنے ہی افکار و خیال کے خد و خال اس آئینہ میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً محبوب کے بیانِ حسن میں، اس کی سیرت و شخصیت کی ترجمانی میں، عشق و عاشقی کی ان گنت واردات و کیفیات کے تذکرے میں، زندگی کی مسرتوں اور دلآویزیوں، محرومیوں کی شاعرانہ عکاسی میں اسے اپنی ہی تصویریں نظر آتی ہیں۔

جمال اور احساسِ حسن غالب کی شاعری کے اہم موضوعات ہیں اور ان کا بیان بڑا رچا ہوا اور ستھرا پن لئے ہوئے ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ احساسِ حسن اور ذوقِ جمال کی ترجمانی غالب کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، ایک طرح یہ ان کی نسلی خصوصیت بھی تھی۔ ماحول کے اثر نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ جس تہذیب و ثقافت کے سائے میں غالب نے آنکھ کھولی اور پرورش پائی وہ صرف حسن اور حسن پرستی سے عبارت تھی۔ ناسازگار حالات نے اس کی دوسری خصوصیات کو گہنا دیا تھا۔ شجاعت صرف تصور ہی میں باقی رہ گئی تھی۔ سپہ گری کا خیال صرف فخر کرنے کے لئے افراد کے دلوں میں پیدا ہو جاتا تھا۔ اب اس کی حیثیت ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی لَو سے زیادہ نہ تھی۔ حسن ان کے ذوقِ جمال کی تسکین کا باعث ہی نہ تھا، اُس کی حیثیت ایک پناہ گاہ، ایک وسیلۂ فرار کی بھی ہو گئی تھی۔ غم غلط کرنے کا ایک طریقہ۔ لیکن اس نے بہرنوع ایک فن کی بھی صورت اختیار کر لی تھی۔ غالب نے اپنی شاعری میں حسن اور اس کے بیان میں ان گنت پہلو اختیار کئے ہیں، ایک ایسی مصوری جو بڑی بوقلموں ہے۔ اس کا محرک بھی غالب کا بلیغ احساسِ جمال تھا۔ غالب میں حسن کا تصور محدود نظر نہیں آتا، بلکہ اس کے شعر میں ذاتی تجربات کا لہو زندگی کی طرح رواں دواں ہے۔ اس میں اجتماعی اور آفاقی شعور بہت زیادہ ہے — ایک عظیم تہذیبی و ثقافتی احساس کی دین۔ چند شعر بالخصوص اس ترجمانی و عکاسی کے نمائندے ہیں:-

سادگی و پُرکاری، بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ ناز بھی کیا گل کتر گئی

دل ہوائے خرامِ یار سے پھر
محشرستانِ بے قراری ہے

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

بظاہر یہ اشعار غالب کے ذاتی اور انفرادی تجربات سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں کہنے والے شخص کا ردِ عمل ہی نمایاں نظر آتا ہے مگر غور سے دیکھیں تو اس ردِ عمل میں بھی ہر انسان کو اپنے ہی دل کی گونج سنائی دے گی حُسن کا تغافل صرف غالب ہی کا تجربہ نہیں رہ جاتا، ہر شخص کے لئے جرأت آزما ہو سکتا ہے۔ کیا محبوب کے رنگ کی شگفتگی صرف غالب کے لئے صبح بہار ہے، میرا خیال ہے کہ ہر صاحب دل اس سے متاثر ہو کر گلہائے ناز کی شگفتگی کا آرزو مند ہو سکتا ہے۔ محبوب کے چہرے پر نقاب کے حُسن کی کیفیت ہر ایک کو غالب ہی کی طرح متاثر کر سکتی ہے۔ اسی طرح تیرِ نیم کش کی خلش سے غالب کی طرح ہر شخص متاثر ہوتا ہے۔ محبوب جب سامنے آتا ہے تو ہر شخص کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوند جاتی ہے اور وہ نہ جانے کیا کیا کچھ سوچتا ہے لیکن وہ محبوب ہی کیا جو اپنے بات نہ کرنے کے انداز سے محبت کرنے والے کو لبِ تشنۂ تقریر نہ چھوڑ دے ۔۔۔ انگشت حنائی کا حسن کس دل کو متاثر نہ کرے گا اور کون ایسا ہے جو اس کو اپنے دل کی آنکھ سے اوجھل کر دے گا۔ محبوب کا نقشِ قدم ہر ایک کو عزیز ہے۔ جہاں جہاں وہ اس نقش کو دیکھتا ہے وہ اسے بہشت ہی نظر آتی ہے۔ محبوب کے خرام سے کس کا دل محشرستانِ بے قراری نہیں بن جاتا، کس کا جی نہیں چاہتا کہ کوئی زلفِ سیاہ رخ پر پریشان کر کے اور دشنۂ مژگاں کو سرمے سے تیز کر کے سامنے نہ آ جائے۔

ان احساسات کا اظہار جس طرح غالب کے ہاں نظر آتا ہے دوسری جگہ کم ہے۔ غالب کی "لذتِ تقریر" سے ہر دل متاثر ہوتا ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ بات تو میرے ہی دل کی بات ہے۔ سچ یہ کہ غالب نے عشق کا جو تصور پیش کیا ہے اور جن قلبی واردات کی عکاسی کی ہے ان میں مجموعی طور پر ایک نوع کی جدت، اچھوتا پن اور التہاب ہے جو دل پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ اس کا جو آفاقی پہلو ہے اب اس سے شاید کو بھی انکار نہ کر سکے۔ غالب اردو شاعری کے مروجہ روایتی تصورِ عشق بھی قائل نہیں۔ اس باب میں بھی اس نے "مرگ انبوہ" میں مرنا اپنی کس شان سمجھا ہے اور اسی لئے اپنا نیا جادہ تراشا ہے جس نے اس کے شعر کو آفاقیت بخشی ہے ۔۔۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ غالب نے بہت حقیقت پسند ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ وہ عشق کو ایک خواہش و آرزو سمجھتے ہیں ان کے خیال میں یہ عشق انسان کی جذباتی اور ذہنی تسکین کا باعث بنتا ہے، لیکن حالات اس منزل تک اسے مشکل ہی سے پہنچنے دیتے ہیں عاشق کی مجبوری، محبوب کی بے نیازی اور زمانہ کی ستم کاری ایسا کر میں حائل ہوتی ہے اور زندگی میں اس عشق کو تکمیل سے ہمکنار نہیں ہو دیتی، لیکن عاشق کا کمال یہ ہے کہ وہ اس کے باوجود زیست کرتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے کے لئے اس کو زندگی سے بہت سے سمجھوتے کرنے پڑ ہیں یا آزمائشوں کی آگ میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ غرض عجب کیفیت ہے اور ان کا بھی حیاتِ انسانی میں بڑا اہم مقام ہے اور جو شخص عشق و عاشق کی مختلف منزلیں طے کرتا ہے اس کے نزدیک یہ کیفیات زندگی کی نفسیاتی حقائق سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہیں۔ اس حقیقت اندازہ کرنے کے لئے چند شعروں کی طرف توجہ فرمایئے:

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

سادگی ہائے تمنا یعنی
پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

انسان بھی ایک عجیب مخلوق ہے۔ عشق و عاشقی کی تباہ کاریوں کو جانتے ہوئے بھی وہ اس دنیا میں قدم ضرور رکھتا ہے۔ بلکہ اپنی افتاد طبع کی بنا پر اس دنیا میں قدم رکھنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عشق سے انسان کے ایک بنیادی جذبے کی تسکین ہوتی ہے، اسی لئے وہ اس کی خاطر آزمائشوں میں سے گذرتا ہے، اَن گنت تکلیفیں اٹھاتا ہے مگر اس کے باوجود وہ اس جذبہ کی پذیرائی کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ اگر وہ عشق کی دنیا میں قدم نہ رکھے تو اس کے دل میں زندگی بھر ایک خلش رہتی ہے، ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے اور یہ سارا جہانِ رنگ و بو بے کیف نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب نے اس کو درد کی دوا اور دردِ بے دوا کہا ہے۔ یہ ہر انسان کے دل کی گونج بھی ہے۔

آدمی جب عشق کی راہ پر چلا تو کبھی تو اس کی لذتوں سے لطف اندوز ہوا کبھی اس راہ کی ایک ایک منزل جان کا عذاب بنی۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ انسانی زندگی کی ہر مسرت بالآخر غم میں تبدیل ہوتی رہتی ہے اسی طرح عشق کی رعنائیاں بھی مصائب پر ختم ہوتی ہیں، پھر انسان کے دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں رہتی۔ یہاں پہنچ کر وہ اندوہِ وفا سے اپنے آپ کو چھڑانا چاہتا ہے مگر محبوب اس کی کب اجازت دیتا ہے۔ محبوب سے ملنے کی خواہش اور وصل سے لطف اندوز ہونے کی آرزو اس کے دل میں پھر بھی فروزاں ہی رہتی ہے۔ وہ اُس کے کوچے میں جاتا ہے تو حیران ہوتا ہے، آرزو پھر بھی پوری نہیں ہوتی۔ زمانے کے ستم بھی اس کو اٹھانے پڑتے ہیں۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ اس عالم میں بھی خیالِ یار سے غافل نہ رہے، لیکن ستم ہائے روزگار کے ہاتھوں اس کے قدم ڈگمگا ہی جاتے ہیں ـــ ادھر وقت تیزی سے بھاگتا ہے۔ زندگی موت کی طرف مسلسل دوڑتی رہتی ہے۔ اور آخر کار اس تمنا کی شمع بجھ جاتی ہے۔ اس آرزو کا چراغ گُل ہو جاتا ہے اور شعلۂ عشق کے سیہ پوش ہونے کی نوبت آ جاتی ہے ـــ یہی انسانی زندگی کا انجام ہے یہی اس زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے ـــ اس سے کوئی انسان نہیں بچ سکتا۔ کسی کو بھی اس سے مفر نہیں!

غالب نے حسن و عشق کے بارے میں اپنے اشعار میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ بلاشبہ آپ بیتی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن غالب کی آفاقیت پسندی نے ان میں جگ بیتی کا رنگ و آہنگ ضرور پیدا کر دیا ہے لیکن اُن کی شاعری کا ایک موضوع ایسا ہے جس کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی میں انہوں نے جگ بیتی ہی بیان کی ہے۔ یہ موضوع ہے حیات و کائنات کے مختلف حقائق کی ترجمانی ـــ غالب کی شاعری میں اس موضوع کو بھی نمایاں جگہ حاصل ہے ـــ بلکہ یہی موضوع ہے جس کی ترجمانی نے ان کی شاعری کو عظمت سے ہمکنار کیا ہے۔ حُسن و عشق کے معاملات و مسائل کو بھی وہ

حیات و کائنات سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔ بلکہ انہیں کا ایک بنیادی جُز سمجھتے ہیں ـــــ اور زندگی کے ایک بنیادی جز کی حیثیت سے اُن کے بارے میں سوچتے اور غور کرتے ہیں ـــــ پھر اُن کی نگاہِ تفکر اس حقیقت کی بھی جستجو کرتی ہے کہ خود زندگی کیا ہے؟ ـــــ اس زندگی میں انسان کی کیا حیثیت ہے؟ اور پھر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ زندگی بے ثبات ہے ـــــ انسان بے بنیاد ہے اس کی حیثیت اس نظامِ حیات میں ایک مجبورِ محض کی ہے اور اُس کا وجود زبانِ حال سے اس بات کا شکوہ سنج ہے۔ زندگی میں غم کی حیثیت مستقل اور مسلسل ہے۔ وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ انسان کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ ان تمام باتوں کے باوجود زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے اور زندہ رہتا ہے۔ ہر انسان کو زندگی کے ہر دور میں ان حقائق کا احساس رہا ہے اور رہتی دنیا تک رہے گا۔ غالب نے ان حقائق کی ترجمانی بڑے ہی مفکرانہ انداز میں کی ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولےٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرم دہقاں ہے

ازل سے انسان انہیں حالات کا شکار ہے۔ زندگی کے سفر میں قدم قدم پر ایسی منزلیں آتی ہیں جب اس کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس کی ہستی بے ثبات ہے۔ اس کا وجود فنا کی دلیل ہے۔ زندگی ایک کربِ مسلسل ہے۔ اس زندگی میں ہر چیز موت کی طرف دوڑی جا رہی ہے۔ ہر خوشی پر غم کا سایہ منڈلا رہا ہے۔ اس لئے اگر خوشی انسان کو حاصل بھی ہو جائے تب بھی وہ اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ تغیر کا خیال اور فنا کا احساس اس کو زندگی کی بے ثباتی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ کائنات کی ایک ایک چیز میں اس کو یہی بے ثباتی نظر آتی ہے اور وہ ان کو دیکھ کر اپنے دل جگر کو خون کرتا رہتا ہے ـــــ غالب نے مختلف زاویوں سے ان حقائق پر اپنی شاعری میں روشنی ڈالی ہے۔ اور اس موضوع نے ان کی شاعری کے آفاقی رنگ و آہنگ کو اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔

غالب کی شاعری کے بنیادی موضوعات حُسن و عشق اور حیات و کائنات کے معاملات و مسائل ہیں۔ انہوں نے ان سب کو خالص انسانی زاویۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ انسانیت اور انسان دوستی کی ان میں ایک لہر سی دوڑی ہوئی ہے۔ اسی لئے ہر انسان کو غالب کے پیش کئے ہوئے یہ مسائل اپنے مسائل معلوم ہوتے ہیں اور وہ ان میں ہر جگہ اپنی ہی تصویر دیکھتا ہے۔

اور یہی ان کے کلام کا آفاقی پہلو ہے۔ ٭

"غالب کہ بقائیش باد"

وجاہت حسین سونی پتی

غالب نے ایک بار مرزا قربان علی بیگ کو لکھا تو: "اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ لیکن میں نے اپنے کو اپنا غیر تصوّر کرلیا ہے"۔ لیکن غالب نہ صرف اپنے تماشائی بن گئے تھے۔ بلکہ مردم شناس اور دوسروں کے جذبات واحساسات کو سمجھنا بھی ان کا ایک محبوب مشغلہ ہوگیا تھا۔ جیسے کہ وہ ایک خط میں خواجہ غلام غوث بےخبر کو لکھتے ہیں: "ستر برس کی عمر ہے۔ بلا مبالغہ کہتا ہوں۔ ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے۔ زمرۂ خواص میں، زمرۂ عوام کا شمار نہیں — میں آدمی نہیں ہوں؛ آدم شناس ہوں،

نگہم نقب بہ گنجینۂ دلہا می زد
مژدہ باد اہل ریا را کہ زمیداں رفتم

غالب نے اپنے دور میں بہت کچھ دیکھا اور زندگی کے بہت سے مظاہر کا شاہدہ کیا۔ مگر وہ صرف اُس دور کے تقاضوں تک محدود نہیں رہے بلکہ ان کی وسعتِ نگاہ بہت دُور تک محیط رہی۔ اس ہمہ گیری کا باعث صرف یہ ہے کہ غالب نے اپنے زمانے میں زمانۂ مستقبل کی شاعری کی ہے۔ اُس نے زندگی کو شعر میں سمونے کے لئے جن چیزوں کا سہارا لیا۔ ان میں سب سے زیادہ فکر اور عقل کی روشنی کا حصہ ہے۔ فکر اور عقل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہے اسی کو فلسفہ کہتے ہیں اور فلسفہ ہی درحقیقت غالب کی شاعری کی اساس ہے۔ غالب کی شاعری کا بیشتر حصہ فکر اور عقل کے امتزاج سے مرتب ہوا ہے۔ یہی فلسفہ نفسیات کی عملی اقدار کے نہایت قریب بھی ہے۔ غالب نے جہاں: "باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا" کہہ کر سائنس کے ایک اہم اصول کی طرف اشارہ کیا، وہاں اس نے زندگی کی نفسیاتی حقیقتوں کو بھی آشکار کیا ہے:

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

نفسیاتی اصول ہے کہ ذہن اور آنکھ، جب پہلی بار کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو اُس کا نیا پن ہر دو کو حیرت و استعجاب کے سمندر میں غرق کر دیتا ہے۔ اس چیز کا پہلا مشاہدہ ذہن اور آنکھ کو اپنے عجز کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جب یہ مشاہدہ بار بار ذہن اور آنکھ کی زد پر آتا ہے تو مشاہدہ کی کیفیت، اہمیت، اصلیت اور حدود اربعہ وہی رہتے ہیں، ان میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا لیکن ذہن اور آنکھ اس مشاہدہ کو دیکھ کر حیرت و استعجاب کے سمندر میں نہیں ڈوبتے۔ وہ اپنی اہمیت و قوت، مشاہدہ سے زیادہ وزنی محسوس کرتے ہیں۔ اور پھر ایسا وقت بھی آتا ہے جب ذہن اور آنکھ کے مقابلے میں کسی چیز کا مشاہدہ خود اپنے عجز کا اعتراف کرتا ہے۔ وہی ذہن اور آنکھ جو مشاہدہ کے روبرو مغلوب تھی، مشاہدہ کو بار بار دیکھنے سے غالب آگئی۔ جب کوئی مشاہدہ یا واقعہ اپنے آپ کو بار بار دہراتا ہے تو اُس کی یہ تکرار اُس کی تاثیر کی شدت کو ضائع کر دیتی ہے۔ چنانچہ غالب کے ہاں ہمیں ایک ایسا شعر بھی ملتا ہے جو اس نفسیاتی حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

اسی طرح غالب کے ہاں خاص اشعار خالص نفسیاتی تصورات کے حامل نظر آتے ہیں۔ نفسیات کی سائنس میں قوتِ قیافہ کو بہت دخل ہے۔ انسان جب کسی طرف سے مایوس ہونا نہیں چاہتا تو وہ اپنے ذہن کو ایک خود فریبی میں مبتلا رکھنے کے لئے قوتِ قیافہ کا سہارا لیتا ہے۔ ہر چند اس کے ذہن میں مایوسی اور ناکامی کے کانٹے بکھر جاتے ہیں۔ مگر قوتِ قیافہ اسے ان کانٹوں سے قریب ہونے سے بچاتی رہتی ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں انسان ایک نفسیاتی سہارا پا کر اپنی مایوسیوں

کو لمحہ بھر کے لئے، (عام طور پر نہیں) خوشگوار اور سکون آمیز لمحات میں تبدیل کر لیتا ہے۔ یہ ایک ... ا نکتہ ہے جو زندگی کے ہر مرحلہ پر موجود ہے۔ زندگی خواہ بچپن کی حدود ... ں ہو یا جوانی کے عالم یا بڑھاپے کے دور میں، اس نکتہ سے کبھی تہی نہیں ... تی۔ اور انسان اپنی ناکامی کو کامرانی میں بدلنے کی سعی کرتا ہے۔ ام ... یہ ذہنی کاوش قوتِ قیافہ کا ایک عکس ہے۔ اسی قوتِ قیافہ کا ایک ع... ں غالبؔ کے ہاں بڑے دلفریب انداز میں نظر آتا ہے۔

ہوئی ... تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ ... آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

اس ز... گی میں پریشانیاں انسان کا لازمی حصہ ہیں۔ انسان کو لازماً ہر دور میں ان ... سے سروکار رہتا ہے۔ زندگی مسرتوں سے بھرپور کیوں نہ ہو لیکن ایک وقت ... ایک انتہائی مسرور انسان یہ سوچ سوچ کر بھی پریشان ہو جاتا ہے کہ یہ خوشیوں کی بے پناہ بارش میرے ہی جلوہ خانے تک کیوں محدود ہے۔ یہ تو پر... یشانیوں کا ایک پہلو ہے۔ لیکن پریشانیاں ایک سنگین پہلو بھی رکھتی ہیں۔ جب انسان خود پریشان ہوتا ہے، تو اسے ہر کوئی پریشان نظر آتا ہے۔ جس طرح ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے، اسی طرح پریشانیوں میں مبتلا انسان کو بھی ہر شے غم و اندوہ میں ڈوبی نظر آتی ہے۔ وہ جس طرف بھی دیکھتا ہے اسے پریشانیوں کی ایک یلغار اپنی طرف بڑھتی محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ سب کچھ خود اس کی اپنی سوچ کے باعث ہوتا ہے۔ وہ اپنے غم میں اس قدر مدغم ہو جاتا ہے کہ بیرونی دنیا کے اثرات اس میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے سے معذور ہوتے ہیں۔ اُس کی ذہنی پریشانیاں اُسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ سارے عالم کا شیرازہ پریشان ہے۔ اور اس دنیا کی ہر ایک چیز پریشانی کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے حالانکہ درحقیقت بات یہ نہیں ہوتی۔ یہ سب اس کی اپنی ذہنی کیفیات کے اثر کا ہی کرشمہ ہوتا ہے۔ نفسیات کے اس مرحلہ کو غالبؔ نے اپنے ایک شعر میں خوب واضح کیا ہے۔ اس شعر میں نفسیاتی حقیقت جس وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے وہ اپنا جواب آپ ہے۔ شعر خود بھی نفیس ہے اور اندازِ بیان اس پر مستزاد۔ انسان کی ذہنی پریشانیوں کے بیرونی اثرات کا عکس دیکھئے:

بُوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

نفسیات کی سطح پر نفرت کا جذبہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ انسان نفرت کی بدولت نہ صرف ذاتی اوصاف سے محروم ہو جاتا ہے۔ بلکہ وہ اپنے کردار و عمل سے معاشرتی زندگی کے لئے ایک بوجھ بھی بن جاتا ہے۔ نفسیاتی اصولوں کے مطابق نفرت کے جذبہ کو پیدا ہونے سے روکا جا سکتا ہے۔ لیکن جب یہ جذبہ پیدا ہو جائے اور دل و دماغ میں جڑ پکڑ لے، تو نفسیاتی قوتیں بھی مدد کرنے سے عاری رہتی ہیں۔ وہ صرف اتنا کر سکتی ہیں کہ اس کی شدّت کو کم کر دیں۔ لیکن اس بیج کو ختم نہیں کر سکتیں۔ غالبؔ کے ہاں بعض اشعار ایسی ہی نفرت کا اظہار لئے ہوئے ہیں۔ ایسی نفرت جو جڑ پکڑنے کے لئے نفسیاتی قوتوں کے حلقہ میں آئی وہ ختم تو نہ ہوئی لیکن اس کی شدّت کم ضرور ہو گئی۔ نفرت کا یہ جذبہ نفسیاتی زاویۂ نگاہ کے مطابق جب پھیل جاتا ہے تو انسان اپنی نگاہ سے اس جوہر کو مٹا دیتا ہے جو اُسے دوسروں کے اوصاف یا خوبیاں سمجھنے کی قوت دے سکتا ہے۔ نفرت کا جذبہ انسان کے دل میں پیدا ہو کر اُسے معاشرتی زندگی میں ایک بوجھ ہی نہیں بنا دیتا بلکہ اس کے عمل پر ایک ایسی کاری ضرب بھی لگاتا ہے کہ انسان کا شیشۂ احساس چکنا چور ہو جاتا ہے۔ نفرت کا یہ غبار انسان کی آنکھوں پر ایک ایسا پردہ ڈال دیتا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے شکریہ کے الفاظ بھلا کر شکوہ کے الفاظ ہی زبان پر لاتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ دُرست ہوگا کہ نفرت کی یہ انتہا نفسیاتی قوتوں کو ختم کر کے انسان کو سراپا فریاد بنا دیتی ہے۔ وہ کسی چیز کی اچھائی کا قائل نہیں رہتا۔ اور نفرت کا جذبہ اس کی فریاد میں ایک ایسی کیفیت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ غالبؔ کے اس شعر کی تفسیر بن کر رہ جاتا ہے:

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

غالبؔ کا یہ کہنا کہ مجھ پر جو ظلم ہوا ہے۔ یہ تو ایک درست بات ہو سکتی ہے، لیکن اوروں پر ظلم ہونا اس بات کی علامت ہے کہ غالبؔ نے نفرت کے انتہائی نکتہ کو نفسیاتی روشنی میں دیکھا ہے۔

غالبؔ کی "نفسیاتی شاعری" میں ہمیں نفسیات کے ہر اصول کے مطابق اشعار ملتے ہیں، جنہیں ہم بجا طور پر غالبؔ کے "نفسیاتی اشعار" کہہ سکتے ہیں۔ پریشانی، نفرت کے علاوہ پچھتاوے کے متعلق بھی غالبؔ کے ہاں نفسیاتی روشنی میں طرح طرح کے اشعار نظر آتے ہیں۔ پچھتاوے کا احساس اس وقت بیدار ہوتا ہے جب انسان کو اس بات کا یقین ہو جائے

کہ اس کی تمام قربانیاں بے کار اور رائیگاں ہو گئی ہوں ۔ اور اس کا ایثار اس کے کسی کام نہ آیا ہو ۔ وہ اپنے ماضی کو یاد کر کے جب اپنے حال تک پہنچتا ہے تو اس درمیانی فاصلہ کو طے کرنے کے بعد اس کے ذہن میں ایک تصور پیدا ہوتا ہے ، وہ تصور ، پچھتاوے ہی کا ہے ۔ اس تمام فاصلے کو ، جس پہ اس کی عقل چلتی رہی ہے اور ذہن کام کرتا رہا ہے دیکھنے کے بعد یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ عقل اور ذہن کی اس رفتار کا باعث نفسیاتی تحریک ہی ہوا کرتی ہے ۔ اس نفسیاتی تحریک کی وجہ سے جو شعر تخلیق ہوا ، اس میں پچھتاوے کی تلخی اس طرح ابھری ہے :

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

تسلسل خیالات کا مسئلہ نفسیات کا بہت اہم مسئلہ ہے ۔ یعنی کسی چیز کے سوچنے میں یہ بات یقینی نہیں ہوتی کہ ہم اس کے بعد کیا سوچیں گے ۔ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم ایسی چیز سوچیں گے جو کبھی پہلی چیز ، یا واقعہ کے بعد ، وقوع پذیر ہوئی ہو ۔

کسی مسئلہ کو منطقی دلائل اور ٹھوس ثبوتوں سے ثابت کرنا اور کوئی بات شعر کے لطیف پیرائے میں بیان کر دینا ، دو بہت مختلف باتیں ہیں ۔ مگر غالب اس مرحلے سے بھی بڑی آسانی کے ساتھ گذر گئے ہیں :

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

دراصل تسلسل خیالات کی وجہ ان کی یکسانیت ہوتی ہے ۔ ایک خیال کسی یکساں چیز کی وجہ سے دوسرے خیال کی طرف متوجہ ہوتا ہے ۔ ایک ایسا جز جو دونوں تجربات میں شامل ہو اور دونوں کے باقی اجزا مربوط کر دیتا ہو ۔ غالب کے ہاں اس بات کی مثال اس طرح سامنے آتی ہے :

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

ایک اور جگہ کہتے ہیں :

غمِ فراق میں تکلیف سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

غالب جب غمِ فراق میں مبتلا ہوتا ہے تو اس وقت کچھ تو لوگ ہی اُس کا مذاق اُڑاتے ہیں اور کچھ اُس کا اپنا مزاج ہی ایسا ہو جاتا ہے کہ ہر چیز اپنی مخالف نظر آتی ہے ۔ اسی طرح جب وہ باغ میں کھلے ہوئے پھولوں کو دیکھتا ہے تو اسے لوگوں کی ہنسی یاد آجاتی ہے ۔ اس لئے جب وہ غمِ ہجراں میں مبتلا ہوتا ہے تو سیرِ گل سے کترانا چاہتا ہے کیونکہ کھلی ہوئی پنکھڑیوں میں اُسے مسکراتے اور مذاق اڑاتے ہوئے چہرے ہی نظر آتے ہیں ۔ ایک اور شعر میں یہی بات ابھر آئی ہے :

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ
جفا میں اس کی ہے انداز کار فرما کا

اس میں بھی یکسانیت کے ذریعے تسلسلِ خیال پایا جاتا ہے ۔ اردو کی دنیائے شاعری میں فلک اور محبوب ہمیشہ سے ہی ستمگر مانے گئے ہیں ۔ اسی لئے غالب کو ہمیشہ فلک دیکھ کر اپنا محبوب یاد آ جاتا ہے تسلسلِ خیالات کی چند اور مثالیں بھی ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا :

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

اور پھر :

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

فرائیڈ کا کہنا ہے ہم ایسی سوسائٹی میں رہتے ہیں ، جہاں ہمارے بہت سے جبلی رجحانات ظاہر ہوتے رہتے ہیں ۔ ان میں ڈر اور جنس کی جبلتیں بہت ممتاز ہیں ۔ لیکن جبلتِ خوف ، جبلتِ جنس کے مقابلے میں بہت کم دبائی جا سکتی ہے ۔ جنسی رُجحانات تقریباً ہر وقت ہمارے ساتھ رہتے ہیں ۔ اس لئے وہ بہت زیادہ دبائے جاتے ہیں ۔ اور جب جنسی جبلت دب جاتی ہے تو انسان کے دماغ میں ایک جنسی کشمکش بھی پیدا ہو جاتی ہے ۔ وہ ہر اس چیز کی طرف بڑھتا ہے جس میں وہ جنسِ مخالف کی جھلک پاتا ہے ۔ وہ اس میں ایک گونا سکون پاتا ہے ۔ اسی رجحان کو غالب نے مختلف طریقوں سے اپنے اشعار میں ظاہر کیا ہے :

کم نہیں نازشِ ہم نامیٔ چشمِ خوباں
تیرا بیمار بُرا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

بظاہر اس شعر میں شاعرانہ لطافت اور الفاظ کی دلچسپ ترکیب

نظر آتی ہے۔ جس میں محبوب کی "چشم بیمار" کی وجہ سے شاعر نے اپنے آپ کو بیمار سمجھنے میں ایک طرح کا سکون اور مزا پایا ہے۔ مگر دراصل یہ زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت ہے "ایک اور جگہ بھی ملاحظہ فرمائیں:

شمارِ سبحہ، مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

اس میں بھی وہی بات ہے۔ چونکہ تسبیح پھیرنے سے شاعر کے محبوب کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں بہت سے دلوں کو قبضے میں کئے ہوئے ہے اس لئے اس نے تسبیح پھیرنے کا مشغلہ اختیار کر رکھا ہے۔ ہوسکتا ہے غالب کے محبوب کو سچ مچ ایسے مواقع حاصل نہ ہوئے ہوں اور اس طرح اس مشکل میں یہ آرزو پوری ہو رہی ہو۔

ٹینی سن کی ایک مشہور نظم ہے جس میں وہ دکھاتا ہے کہ کسی عورت کا شوہر مرگیا اور اس پر سکتہ طاری ہوگیا۔ وہ کسی طرح نہ روتی تھی۔ لوگوں نے طرح طرح کی تدبیریں کیں مگر کارگر نہ ہوئیں۔ آخرکار ایک بڑھیا نے اس کی گود میں اُس کا بچہ لاکر ڈال دیا۔ ماں نے بے اختیار اس کا منہ چومنا شروع کردیا۔ اور آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ بچے میں اُس نے اپنے مردہ شوہر کو پالیا تھا۔

ایک اور شعر ہے:

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے

اس شعر میں بھی جنسی جبلّت کارفرما ہے۔ ایک تو وہ جو غالب نے صاف صاف ظاہر کردی ہے۔ یعنی وہ مصوری اس لئے سیکھتے ہیں کہ وہ مہ رخوں کی ملاقات کا وسیلہ بن جائے۔ اس طرح مصوری جنسی کشش کا باعث ہوئی۔ لیکن اس میں ایک اور بڑی حقیقت بھی موجود ہے۔ جو لفظ "مصوری" میں پنہاں ہے۔

مصوری اور دیگر تمام فنون جنسی دباؤ کا اظہار ہوتے ہیں۔ جب ہم اپنی اس جبلّت کو دبا لیتے ہیں تو یہ اپنے اظہار کے لئے دوسرے راستے اختیار کرتی ہے۔ جن میں دو بڑے راستے شاعری اور مصوری بھی ہیں۔ بقول فرائڈ دیکھا جائے تو علوم و فنون بھی انسانوں کے لئے ایک قسم کا جنسی نعم البدل ہیں۔ اور تہذیب بذاتِ خود ایک بڑی حد تک ان قوتوں کی جان ہوتی ہے جو مخزنِ جنسی کی پیداوار ہیں۔ فرائیڈ بھی یہی بتاتا ہے کہ مصوروں کے تمام شاہکاروں میں ان کے لاشعور کے جنسی خیالات جھلکتے ہیں۔

اسی طرح شاعر کا ذہن معمولی آدمی کے ذہن سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے شعور میں جذبات کی کشمکش بھی شدید ہوتی ہے اور ردِّعمل شدید تر۔ غالب:

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

اس شعر میں شاعر کی ذہنی کیفیت جلنے کی ہے۔ اس کے اندر ایک آگ ہے جس سے وہ جلنا چاہتا ہے۔ شاعر نے ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن سے جلنے کی طاقت مختلف روپ بدل رہی ہے۔ شاعر باہر کی دنیا کو نہیں، اندر کی دنیا کو بیان کر رہا ہے۔ غالب کا گہرا مطالعہ ہمیں بتائے گا کہ وہ داخلی کیفیات کا بہترین نقاش ہے۔ اس کا لاشعور جلنے کن جذبات کا ضامن ہے ——

اور جب لاشعور کی طاقت ہم پر پورا قبضہ جمالے اور ہماری حرکات ہماری بن جائیں تو پھر نتائج بہت خطرناک ہوجاتے ہیں۔ دیوانگی اور خودکشی ایسی ہی حالت میں ہوتی ہے۔ شراب نوشی، افیون، چرس وغیرہ کا عادی بننا بھی ایسے وسیلے ہیں جو از خود وارفتگی کی کوشش سمجھی جائیں اور اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ غالب نے اس نکتہ کو اس طرح پایا ہے:

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بےخودی مجھے دن رات چاہیئے

شاعر شراب اس لئے پیتا ہے کہ اُسے بےخودی ہو۔ بلکہ وہ حقیقت کی دنیا سے بھی بھاگنا چاہتا ہے۔

ایک اور شعر:

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

نفسیات میں یہ مسئلہ کتنا عام ہے کہ خواب ہماری خواہشات کے عکاس ہیں۔ وہ آرزوئیں جو ہم دن میں پوری نہ کرسکے، یہ ہمارے لاشعور میں دب کر رہ جاتی ہیں۔ اور رات کو جب ہم سو جاتے ہیں تو چوروں کی طرح لاشعور سے نکل کر ہمارے خوابوں میں در آتی ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ شاعر کے لئے یہ بات کس قدر باعثِ مسرت ہوگی کہ اس کا محبوب اس کے یہاں آئے اور آئندہ ملنے کا عہد

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

غالبؔ کا اعتذار

سید قدرت نقوی

غالبؔ کا بچپن، ناز و نعم میں گزرا، زمانہ نے ایک ٹھوکر لگائی، باپ اور چچا کا سایہ سر سے اٹھا، ننھیال نے گلے لگایا، سسرال نے سہارا دیا، طبیعت جوان، ہمت بلند، حوصلہ قوی، زمانہ کے سرد و گرم کو سہتے رہے۔ کمال خرد، جو عوام کو جنوں نظر آتا ہے، اس نے تخیل کو اوج و عروج بخشا اور اس رفعت تک اس کی پرواز ہوئی، جہاں بالعموم پہنچنا، ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ لیکن "اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن" کی نمود اسباب ظاہری و مادی کے فقدان کی شکل میں رونما ہوئی جس نے مصائب و آلام کا شکار بنا کر یہ کہنے پر مجبور کر دیا۔ "مارا زمانہ نے اسد اللہ خاں تمہیں"۔ لکد کوب حوادث کا یہ صید زبوں حال، اپنے آخری ایام، کس کرب و اضطراب میں بسر کرتا ہے، دیکھنے کے لئے "دیدۂ عبرت نگاہ" اور سننے کے لئے "گوشِ حقیقت نیوش" کی ضرورت ہے۔

کائنات میں حرکت و تغیر در اصل حیات اور اس کے ارتقاء و زوال کا سبب ہے، اسی لئے حیات انسانی مختلف ادوار سے گزرتی ہوئی نقطۂ عروج پر پہنچ کر رو بزوال ہوتی ہے۔ ارتقائی منازل بڑی تیزی سے طے ہوتی ہے۔ مگر تنزلی کیفیت میں نرمی و آہستگی پائی جاتی ہے، کیونکہ "ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام" کے پیشِ نظر:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا!

ہمت کو بلند، حوصلہ کو قوی، اور عزم کو پختہ بنانے اور طبیعت کو انگیخت کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ ہر انسان اپنی بساط کے مطابق جہد للبقا میں مشغول و مصروف رہتا ہے۔ اپنی کوشش کی منزلِ ارتقا پر پہنچ کر پیچھے مڑ کر، ایک نظر ڈالتا ہے، تو کبھی طمانیت قلب، اور کبھی اضطراب قلب کے سامان نظر آتے ہیں۔ طمانیت و اضطراب کی منازل پھر اسے مقام جہد پر کھینچ لاتی ہیں۔ وہ رزمگاہِ حیات میں پھر نبرد آزمائی کی ہمت کرتا ہے۔

مگر نقطۂ عروج کے بعد منازل زوال شروع ہو جاتی ہیں، اس لئے بہت جلد اضمحلال کا شکار ہو جاتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

غالبؔ کے عناصر کی بے اعتدالی کے دور میں، نواب یوسف علی خاں ناظمؔ والیٔ رامپور نے غالبؔ کے متعلق کتنا صحیح لکھا تھا:

"ایسی نظم، ایسی تاریخیں، دوسرے سے کب ہو سکتی ہیں۔ حقا! کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے مثل اور عدیم النظیر پیدا کیا ہے۔ جس کمال کو دیکھئے، اس میں آپ کی ذات فردِ کامل ہے ......

آپ کا ہدیۂ مرسلہ اکثر نقلِ محفل رہتا ہے۔ جو سنتا ہے، جو دیکھتا ہے، وارفتہ ہو جاتا ہے۔ سچ ہے، ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ہزاروں برس فلک، چرخ لگاتا ہے، تب کہیں ایک شخص اس کمال کا پیدا ہوتا ہے۔" (مکاتیب غالبؔ حواشی ص ۴۵)

آیئے! اس بے مثل عدیم النظیر، فرد کامل اور نابغۂ دہر کی عمر کے آخری حصہ کا جائزہ لیں، اور زمانہ کی کرہناکی، حالات کی ستم ظریفی، قوتِ جسمانی کی ناتوانی، حوصلہ و ہمت کی بے چارگی، عقل و خرد کی ابتری و پریشانی کا مشاہدہ کریں۔ وجود انسانی کی نشو و نما، ارتقاء و زوال کی منازل، جب سامنے آتی ہیں تو سب سے زیادہ حسرتناک زمانہ، یہی بڑھاپے اور بیماری کا زمانہ ہے جو کشاں کشاں انسان کو موت کی طرف لے جاتا ہے۔ یہی جاتما بدھ کے لئے ذریعہ عرفان بنا۔ اسی بے چارگی و بے بسی سے نسل انسانی کو نجات دلانے کے لئے وہ مضطرب ہوئے۔

مگر، بفحوائے آیت کلام الٰہی "کلُّ نفس ذائقۃ الموت" سے مفر نہیں کیونکہ "موت کا ایک دن معین ہے"۔ اور حرکت و تغیر کا تقاضہ بھی یہی ہے ورنہ "نقش، شوخیٔ تحریر کا فریادی" نہ بنے۔ اور "ہر تصویر" پیرہن کاغذی نہ پہنے۔ دنیا تصویر خانہ، نہ رہے اور یہاں شب و روز تماشا نہ ہو۔ کرشمۂ زوال ہی محرک ارتقا ہے۔ منزل ارتقا کی محفلیں "تو گنجفہ باز خیال" برہم کرتا ہے اور "ورق گردانیٔ نیرنگ یک بت خانہ" میں مشغول رکھتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ کیفیت ہو جاتی :

ضعف سے ہے، نے قناعت سے، یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہ ہمت مردانہ ہم

اگرچہ غالب کی شکایت ضعف و اضمحلال کا سلسلہ ۱۸۴۸ء تک پہنچتا ہے لیکن وہ ۱۸۶۶ء تک ذہنی و جسمانی تکالیف بہر طور برداشت کرتے رہے۔ مگر ۱۸۶۶ء میں جب وہ رامپور سے لوٹ رہے تھے، مراد آباد کے نزدیک دریائے رام گنگا عبور کیا ہی تھا کہ کشتیوں کا عارضی پُل ٹوٹ گیا۔ یہ اِدھر، سامان اور ملازمین اُدھر، جاڑے کا موسم، بڑھاپے کا زمانہ، بارش کا زور، بھیگتے بھاگتے، مراد آباد کی سرائے میں پہنچے۔ صرف ایک کمبل میں طویل رات گزاری اور اپنے اس شعر کی تفسیر مجسم بن گئے :

گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

صبح کو صاحبزادہ ممتاز علی خاں کے آدمی پہنچے اور نواب سعید الدین خاں کے ہاں لے گئے۔ پھر مولوی محمد حسن خاں صدر الصدور مراد آباد اپنے گھر لے آئے۔ تینوں تعظیم و توقیر بجا لائے۔ علاج، معالجہ کرایا۔ یہ پانچ دن ٹھہرنے کے بعد عازم دہلی ہوئے۔ ۸ر جنوری ۱۸۶۶ء کو "قضائے الٰہی" یا "بلائے ناگہانی" کی مانند اپنے گھر پر نازل ہو گئے۔ آتے ہی شاگردوں اور دوستوں کو اپنی حالت زار تحریر کی۔ نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور کو یہی حالات سفر بالتفصیل لکھے ہیں۔ بیخبر، تفتہ، جنون بریلوی، احمد حسن مودودی کو بھی تکالیف سفر اور عوارض سفر سے آگاہ کیا ہے۔ جنوری کا مہینہ اسی طرح گزرا، فروری سے جو شکایات شروع ہوئیں وہ نواب رامپور کو خط مورخہ ۱۵ر فروری ۱۸۶۶ء میں لکھتے ہیں :

"اب اس درویش دلریش کا حال سنئے! اسامعہ مدت سے کھو بیٹھا، اب آنکھوں کو بھی رو بیٹھا۔ دور سے صرف قد و قامت آدمی کا دیکھا جاتا ہے۔ چہرہ اچھی طرح نظر نہیں آتا ہے۔ فقدان راحت، سقوطِ اشتہا، ضعف بصر، ضعف بخت، میرا حال بعینہٖ میرے اس شعر کے موافق ہے :

درکشاکش ضعفم، نگسلد روان از تن
اینکہ من نمی میرم، ہم ز ناتوانیہاست"

(مکاتیب غالب ص[illegible])

۲۹ر مارچ کو صرف اتنا لکھا، "اپنا حال اس سے زیادہ کیا لکھوں کہ آگے ناتواں تھا اور اب نیم جاں ہوں"۔ مگر جب ثقل سماعت، ضعف بصر کے علاوہ ہاتھ پاؤں میں رعشہ کے آثار ظاہر ہوئے تو اصلاح اشعار سے معافی چاہتے ہوئے، ۸ر اپریل ۱۸۶۶ء کے خط بنام احمد حسن مودودی میں اپنی حالت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے :

"آپ کو میرے حال کی بھی خبر ہے؟ ضعف نہایت کو پہنچ گیا۔ رعشہ پیدا ہو گیا۔ بینائی میں بڑا فتور پڑا، حواس مختل ہو گئے۔ جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجا لایا۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے، نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں، شاہ شرف علی بو قلندر کو بسبب کبر سن کے خدا تعالیٰ نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کر دی تھی میں متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمت اصلاح اشعار مجھ پر معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا، لکھ دیا کروں گا۔"

(خطوط غالب ص۴۲۴)

صحت بہت تیزی سے گر رہی تھی، اضمحلال کا سخت حملہ ہو رہا تھا، ضعف بھی اپنی گرفت سخت کرتا جا رہا تھا اور یہ تمام سفر رامپور کی برکات تھیں۔ زندگی سے بھی ناامید ہو کر دن گن رہے تھے گویا :

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہئے

ایسے ہی عالم میں خط بنام حبیب اللہ خاں ذکا مورخہ ۱۲ر مئی ۱۸۶۶ء میں لکھتے ہیں :

"تم کو میری خبر بھی ہے! آگے ناتواں تھا، اب نیم جاں ہوں۔ آگے بہرا تھا، اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رام پور کے سفر کا رہ آورد ہے۔ رعشہ و ضعفِ بصر جہاں چار سطریں لکھیں، انگلیاں ٹیڑھی ہوگئیں، حرف سوجھنے سے رہ گئے۔ اکہتر برس جیا، بہت جیا۔ اب زندگی برسوں کی نہیں، مہینوں اور دنوں کی ہے۔"

(خطوطِ غالب ص ۴۰۶)

یہی حالت غلام غوث خاں بیخبر کو لکھی ہے: "طاقت سلب، حواس مفقود، امراض مستولی، بقول نظامی: بیکے مردہ شخصم بمردی رواں"۔ البتہ صوفی منیری کو اور زیادہ وضاحت سے لکھا ہے:

"فقیر اپنا حال زار لکھتا ہے۔ اکہتر برس کی عمر، پانوں سے اپاہج، کانوں سے بہرا۔ دن رات پڑا رہتا ہوں۔ دو سطریں لکھیں، بدن تھرّایا۔ حرف سوجھنے سے رہا۔ قوتیں ساقط، حواس مختل، غذا قلیل بلکہ اقل:

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا"

(خطوطِ غالب ص ۶۰۹)

اس سال ۱۸۶۶ء کے آخر تک کم و بیش یہی باتیں ہر ایک کو لکھی ہیں۔ خط بنام احمد حسن مودودی مورخہ ۱۸؍ اکتوبر ۱۸۶۶ء میں لکھتے ہیں:

"بہتر برس کا آدمی، پھر رنجور دائمی، غذا یک قلم مفقود، آٹھ پہر میں ایک بار آب گوشت پی لیتا ہوں، نہ روٹی، نہ بوٹی، نہ پلاؤ، نہ خشکا، آنکھ کی بینائی میں فرق، ہاتھ کی گیرائی میں فرق، رعشہ مستولی، حافظہ معدوم۔" (خطوطِ غالب ص ۴۲۶)

اسی زمانہ میں میر غلام بابا رئیس سورت کے ہاں رجب ۱۲۸۳ھ میں ایک تقریب ہونے والی تھی۔ میاں داد خاں سیاح نے اس کی اطلاع دی تو غالب نے نواب صاحب کو لکھا: "میرا حصہ مجھ کو پہنچ رہے گا، خاطر جمع ہے۔" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاح نے اس تقریب کے متعلق بالتفصیل لکھا تھا۔ غالب کے اس جواب سے سیاح نے نتیجہ غلط اخذ کیا اور لکھا کہ کیا آنے کا ارادہ ہے؟ غالب نے ۵؍ ستمبر کو جواب دیا:

"اجی وہ تو میں نے نواب صاحب کو ہنسی سے ایک بات لکھی تھی، دوستانہ اختلاط تھا۔ بھئی میں بہرا ہوں، گانا کیا سنوں گا! بوڑھا ہوں، ناچ کیا دیکھوں گا۔ غذا چھ ماشے آٹا، کھانا کیا کھاؤں گا؟ بمبئی، سورت میں انگریزی شرابیں ہوتی ہیں، اگر وہاں آتا اور شریکِ محفل ہوتا تو پی لیتا۔"

(خطوطِ غالب ص ۴۴۵)

اور جب میر غلام بابا نے خود غالب کو جشن کے علیہ (پروگرام) سے آگاہ کیا، اور جشن کے لوازمات و انتظامات کی تفصیل لکھی، اور دعوت شرکت دی، تو غالب ناتواں و نیم جاں کے دل پر جو گزری، وہ ۴؍ نومبر کے خط سے ظاہر ہے:

"رقعۂ گلگوں نے بہار کی سیر دکھلائی، سواری ریل روانہ ہونے کی ہر دل میں آئی۔ پانوں سے اپاہج، کانوں سے بہرہ، ضعفِ بصارت، ضعفِ دل، ضعفِ معدہ، ان سب ضعفوں پہ ضعفِ طالع۔ کیوں کر قصدِ سفر کروں؟ تین چار شبانہ روز تفس میں کس طرح بسر کروں؟ گھنٹہ بھر میں دو بار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ ایک ہفتے، دو ہفتے کے بعد ناگاہ قولنج کے دورے کی شدت ہوتی ہے۔ طاقت جسم میں، حالت جان میں نہیں، آنا میرا سورت کسی صورت، حیّزِ امکان میں نہیں۔"

(خطوطِ غالب ص ۴۱۵)

دسمبر ۱۸۶۶ء میں غالب کی حالت زار یہ ہو گئی تھی، جو انہوں نے ۴؍ دسمبر کو خط بنام ذکا اور ۵؍ دسمبر کو خط بنام ابراہیم علی خاں وفا میں لکھی ہے:

"زیستن دشوار، اس مہینے یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ سے تہتّرواں برس شروع ہوا۔ غذا صبح کو سات بادام کا شیرہ، قند کے شربت کے ساتھ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی، قریب شام کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب۔ چھ گھڑی رات گئے پانچ روپیہ بھر شرابِ خانہ ساز

اور اسی قدر عرق شیر۔ اعصاب کے ضعف کا یہ حال
کہ اٹھ نہیں سکتا۔ اور اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر چارپایہ
بن کر اٹھتا ہوں، تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔ مع ہذا دن
بھر میں دس بارہ اور اسی قدر رات بھر میں پیشاب
کی حاجت ہوتی ہے۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی
ہے۔ اٹھا اور پیشاب کیا اور پڑ رہا۔ اسباب حیات
میں سے یہ بات ہے کہ شب کو بدخواب نہیں ہوتا۔
بعد اراقت بول بے تکلف نیند آجاتی ہے۔"
(خطوط غالب ص۱۶۱)

"قبلہ! ضعف نے مضمحل کر دیا ہے۔ حواس
بجا نہیں۔ اسی مہینہ یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ سے
تہترواں برس شروع ہوگیا۔ غذا باعتبار آرد، برنج مفقود،
صبح کو پاؤ سات بادام کا شیرہ، بارہ بجے آب گوشت،
شام کو چار کباب تلے ہوئے۔ بس آگے خدا کا نام۔"
(خطوط غالب ص۴۱۹)

۱۸۵۷ء کی قیامت صغریٰ کے بعد انگریزوں نے تالیف قلوب کے لئے بہت سے طریقے اختیار کئے جن میں اسکولوں، کالجوں اور سوسائٹیوں کے انعقاد کو اولیت حاصل ہے۔ دہلی اور لاہور میں علمی اور ادبی سوسائٹیاں قائم کی گئیں اور ان کی سرپرستی کی گئی۔ دہلی سوسائٹی کے قیام کے بعد اراکین نے غالب کو بھی اس میں شریک کر لیا۔ کتابوں پر ان سے رائے لی جاتی، ان کی تصانیف کو سراہا جاتا۔ اس کے اجلاس ہوتے جس میں اہل دہلی اپنے مضامین وغیرہ پڑھتے، انگریز حکام بھی شریکِ اجلاس ہوتے۔ چنانچہ ۱۱ر اگست ۱۸۶۵ء کو غالب بھی ایک مضمون پڑھ چکے تھے۔ دسمبر ۱۸۶۶ء میں سر ڈانل میکلوڈ لفٹننٹ گورنر پنجاب دہلی آئے تو سوسائٹی نے سرپرستی کی درخواست کی۔ اسی سلسلہ میں، ۱۸ر دسمبر ۱۸۶۶ء کو ایک دربار منعقد کیا گیا جس میں اہل علم و ادب و فن کی حوصلہ افزائی کی گئی اور سماجی مصلحین کے کارناموں کو سراہا گیا۔ لفٹننٹ گورنر نے اردو میں تقریر کی، تقریر سے پہلے صرف غالب کو خلعت عطا فرمایا اور تقریر میں بھی اس کا ذکر کیا۔ (مزید دیکھئے "غالب کا رابطہ فرنگ" مطبوعہ "ماہ نو" فروری ۱۹۶۳ء) غالب بے حد کمزور تھے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ اس دربار میں بھی خلعت لینے کے لئے وہ پیارے لال آشوب کے سہارے لفٹننٹ گورنر کے پاس تک پہنچے تھے۔ یہ غیر متوقع مرحمت خاص، غالب کے دلِ پژمردہ کے لئے بہجت انگیز ثابت ہوئی اور گردِ ملال و رنج راہ کو تھوڑی دیر کے لئے بھلا دیا، جس کا کیف کچھ دن کے لئے غم غلط کرنے کا ذریعہ بنا۔ نواب رامپور وغیرہ کو اسی کیفِ نشاط کے عالم میں خطوط لکھے، لیکن یہ کیفیت بہت جلد ختم ہوگئی، کیونکہ ایک سال کی مدت میں امراض گوناگوں اور ضعف نے یہ حال کر دیا تھا:

ہو فشارِ ضعف میں، کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

ہجوم مصائب نے انہیں ایسا گھیرا کہ وہ "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا"
کی منزل میں پہنچ کر:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

کی جیتی جاگتی تصویر بن چکے تھے، لیکن یہ تمام باتیں قویٰ میں تاب و تواں رہنے تک کی ہیں، کیونکہ:

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے

مگر غالب کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی۔ تندرستی کا فقدان، تنگدستی کی بہتات، اور مصائب و آلام کی افراط۔ پھر بھی غالب کی طمانیت کا یہ عالم تھا:

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

زمانہ کی نیرنگی اور عقیدت ابنائے زمانہ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ایسا انسان جس کا یہ عالم ہو، کہ اٹھنا بیٹھنا دشوار، لکھنا پڑھنا محال، سننا ناممکن، دیکھنا مشکل، طاقت زائل، حواس مختل، نہ ہوش قائم، نہ عقل درست۔ مگر دوستوں اور شاگردوں کا تقاضہ کہ خط کا جواب دو، کلام پر اصلاح دو، بعالم مجبوری اکمل الاخبار میں یہ اعتذار چھپوایا:

"دیگر از خویشتم خبر نبود، تکلف برطرف
ایں قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم
ہجوم غم سے فراغ نہیں، اگرچہ گوشہ نشین و خانماں خراب ہوں۔

لیکن بحسب رابطۂ ازلی کثیر الاحباب ہوں۔ اطراف و جوانب سے خطوط آتے ہیں۔ ادھر سے بھی ان کے جواب لکھے جاتے ہیں، جو اشعار واسطے اصلاح کے آتے ہیں، بعد اصلاح بھیجدئے جاتے ہیں۔ اُن صاحبوں میں سے اکثر ایسے ہیں کہ میں نے انہیں، نہ انھوں نے مجھے دیکھا ہے۔ محبت دلی اور نسبت روحانی سہی، لیکن صاحبان بلادِ دور دست کیا جانیں، میرا حال کیا ہے؟ ہفتاد و یک سالہ عمر کی کتاب میں فصلِ آخر کی حقیقت یہ ہے کہ دس پندرہ برس سے ضعف سامعہ و قلت اشتہا میں مبتلا ہوا، اور یہ دونوں علتیں روز افزوں رہیں۔ حسِ حافظہ کا بطلان علاوہ۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی، یہ امراض بھی بڑھتے گئے۔ قصہ مختصر اب سامعہ کا حال یہ ہے کہ ایک تختہ کاغذ کا مع دوات قلم سامنے دھرا رہتا ہے۔ جو دوست آتے ہیں پرسشِ مزاج کے سوا اور کچھ کہنا ہوتا ہے، وہ لکھ دیتے ہیں۔ میں اُن کی تحریر کا جواب زبانی دیتا ہوں۔ غذا کی حقیقت یہ ہے کہ صبح کو آٹھ دس بادام کا شیرہ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا پانی، دو گھڑی دن رہے دو یا تین تلے ہوئے کباب۔ نسیان حد سے گزرا۔ رعشہ، ضعف بصر یہ یاران نو آمدہ ہیں۔ میر تقی مرحوم کا مطلع وردِ زباں ہے:

مشہور ہیں عالم میں، مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ در پے ہو، ہمارے کہ نہیں ہم

خط بکس میں یا کتاب میں رکھ دیتا ہوں اور بھول جاتا ہوں۔ آگے لیٹے لیٹے خط لکھتا تھا، اب رعشہ یوں بھی نہیں لکھنے دیتا۔

"صاحب اکمل الاخبار اور صاحب اشرف الاخبار نے، جو ہمیشہ مجھ سے ملتے جلتے رہتے ہیں اور میرا حال جانتے ہیں، ازروئے مشاہدہ میرے کلام کی تصدیق کرکے اس اعتذار کو اپنے اخبار میں چھاپا ہے۔ کل دیگر صاحبانِ مطبع اور راقمانِ اخبار اگر اسی عبارت کو اپنے اخبار کے اوراق میں درج کریں گے تو فقیر اُن کا احسان مند ہوگا۔

"اس نگارش کی شہرت سے مقصود یہ ہے کہ میرے احباب میرے حال سے اطلاع پائیں۔ اگر خط کا جواب یا اصلاحی غزل دیر میں پہنچے تو تقاضا اور اگر نہ پہنچے تو شکایت نہ فرمائیں۔ میں دوستوں کی خدمت گزاری میں کبھی قاصر نہیں رہا۔ اور خوشی خوشنودی سے کام کرتا رہا۔ جب بالکل نکما ہو گیا، نہ حواس باقی رہے، نہ طاقت، پھر اب کیا کروں؟ بقول خواجہ وزیر:

میں وفا کرتا ہوں، لیکن دل وفا کرتا نہیں

اگر کسی صاحب کو میری طرف سے کچھ رنج و ملال ہو تو خالصاً للہ معاف فرمائیں۔ اگر جوان ہوتا تو احباب سے دعائے صحت کا طالب گار ہوتا۔ اب جو بوڑھا ہوں تو دعائے مغفرت کا خواہاں ہوں۔

غالب"

غالب کا یہ اعتذار چھپا، لیکن اس پر کسی نے نہ دھیان دیا اور نہ عمل کیا۔ یہ اعتذار کب چھپا؟ سیاح کو ۲۳ اور ۲۹ اپریل کے خط میں لکھتے ہیں:

"بھائی! تم نے اخبار اطراف و جوانب میں میرا حال دیکھا ہوگا۔ میں اب محض نکما ہو گیا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے پچاس جگہ سے اشعار واسطے اصلاح کے آئے ہوئے بکس میں دھرے ہیں۔ ازانجملہ تین صاحبوں کے نام لکھتا ہوں۔ میر ابراہیم علی خاں صاحب، میر عالم علی خاں صاحب، نواب عباس علی خاں، رئیسِ رامپور کے حقیقی ماموں۔ غرضیکہ انہیں اوراق میں تمہارے کاغذ بھی دھرے ہوئے ہیں۔ جس دن ذرا افاقت پاؤں گا، تو ان سب کاغذ کو دیکھوں گا۔"

(خطوط غالب ص ۴۴۲)

"پہلے یہ پوچھتا ہوں کہ میری طرف سے جو اعتذار چھپا ہے، وہ تمہاری نظر سے گزرا ہے یا نہیں؟ نہ گزرا ہو، تو اکمل الاخبار ماہ شوال کے چاروں ہفتے کے دو ورقے دیکھ لو! ایک ہفتے میں نکل آئے گا۔" (ص ۴۴۸)

اس بیان سے مترشح ہے کہ یہ اعتذار ماہ شوال میں شائع ہوا تھا۔ جب انگریزی مہینہ سے تطبیق کرتے ہیں تو یکم شوال ۱۲۸۳ھ، ۶ فروری ۱۸۶۷ء بدھ کے دن واقع ہوتی ہے، اس لئے اعتذار فروری کے مہینہ میں لکھا گیا ہوگا۔ چنانچہ ایک خط بنام حبیب اللہ خاں ذکا ۱۵ فروری ۶۷ء کا ملتا ہے جس کا مضمون اعتذار ہی جیسا ہے۔ اور میر تقی میر کا وہی مطلع جو اعتذار میں ہے اس میں بھی ہے:

"ستر بہتر، اردو میں ترجمۂ پیر خرف ہے۔ میری بہتر برس کی عمر ہے، پس میں "اخرف" ہوا۔ گویا حافظہ کبھی تھا ہی نہیں، سامعہ باطل بہت دن سے تھا، رفتہ رفتہ وہ بھی حافظے کی مانند معدوم ہو گیا۔ اب مہینے بھر

سے یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں، رسمی پرسشِ مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں غذا مفقود ہے۔ صبح کو قند اور شیرۂ بادام مقشر، دوپہر کو گوشت کا پانی، سرِ شام گوشت کے تلے ہوئے کباب، سوتے وقت پانچ روپے بھر شراب اور اسی قدر گلاب۔ خرف ہوں، پوچ ہوں، عاصی ہوں، فاسق ہوں، روسیاہ ہوں۔ یہ شعر میر تقی کا میرے حسبِ حال ہے:

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

(ص۴۶۳ خطوطِ غالب)

اس خط کے مضمون کی روشنی میں یہ خیال درست ہوگا کہ اعتذار اسی زمانہ میں لکھا گیا ہے۔ اس لئے اعتذار کا فروری کے عشرۂ ثانی میں لکھا جانا قرینِ قیاس ہے۔ یہ اعتذار سب سے پہلے صفدر مرزا پوری نے برآمد کیا، معلوم نہیں انہیں یہ کہاں سے دستیاب ہوا تھا۔ انہوں نے یہ رسالہ اردو ماہی، دکن ص۱۲۷ جلد ۹ حصہ ۳۴ بابت اپریل ۱۹۲۹ء میں بعنوان "مرزا نوشہ کا آخری خط" شائع کرایا تھا۔ یہ تو بداہتہً غلط ہے کہ یہ مرزا نوشہ کا آخری خط ہے، کیونکہ فروری، ۱۸۶۹ء کے بعد بھی خطوط کا سلسلہ جاری رہا ہے مسئلہ صرف اس قدر باقی رہ جاتا ہے کہ آیا یہ کسی کے نام کا خط ہے، یا اعتذار؟ اس کے لئے اگر عبارت کا بغائر نظر مطالعہ کیا جائے تو عبارت خود شاہد ہے کہ اعتذار ہی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ۲۵ اگست کا یہ خط بنام سیاح ملاحظہ فرمایئے جس سے اعتذار کے اثر اور اس کے نفسِ مضمون پر روشنی پڑتی ہے، اور غالب کی مجبوری و معذوری کا علم بھی ہو جاتا ہے:۔۔

" نورِ چشم، اقبال نشان، سیف الحق میاں داد خاں سیاح کو غالب نیم جاں کی دعا پہنچے۔ واقعی تمہارے دو خط آئے۔ آگے میں لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا اب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہاتھ میں رعشہ، آنکھوں میں ضعف بصر۔ کوئی متصدی میرا نوکر نہیں ہے۔ دوست آشنا کوئی آجاتا ہے تو اس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔

بھائی! میں تو کوئی دن کا مہمان ہوں۔ اور اخبار والے میرا حال کیا جانیں؟ ہاں! اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار والے کہ یہ یہاں کے رہنے والے ہیں اور مجھ سے ملتے رہتے ہیں، سو ان کے اخبار میں، میں نے اپنا مفصل حال چھپوا دیا ہے، اور اس میں، میں نے عذر چاہا خطوں کے جواب اور اشعار کی اصلاح سے۔ اس پر کسی نے عمل نہ کیا، اب تک ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار واسطے اصلاحوں کے چلے آتے ہیں اور میں شرمندہ ہوتا ہوں۔ بوڑھا، اپاہج، پورا بہرا، آدھا اندھا، دن رات پڑا رہتا ہوں۔ حاجتی پلنگ کے تلے دھری رہتی ہے تشت چوکی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے۔ سو تشت چوکی پر تیسرے چوتھے دن اتفاق جانے کا ہوتا ہے، اور حاجتی کی حاجت بسبب سرعت بول کے گھنٹہ بھر میں پانچ چھ بار ہوتی ہے"۔

اس خط میں، وہ تمام باتیں جو اعتذار میں خاص تھیں مختصراً بیان کر دی گئی ہیں۔ اب اعتذار کی اس عبارت پر غور فرمایئے:

" صاحب اکمل الاخبار اور صاحب اشرف الاخبار نے جو ہمیشہ مجھ سے ملتے جلتے رہتے ہیں اور میرا حال جانتے ہیں۔ از روئے مشاہدہ میرے کلام کی تصدیق کر کے، اس اعتذار کو اپنے اخبار میں چھاپا ہے۔ کل دیگر صاحبانِ مطبع اور راقمانِ اخبار اگر اسی عبارت کو اپنے اوراق میں درج کریں گے تو فقیر اُن کا احسان مند ہوگا۔

اس نگارش کی شہرت سے مقصود یہ ہے کہ میرے احباب میرے حال سے اطلاع پائیں۔ اگر خط کا جواب یا اصلاحی غزل دیر میں پہنچے تو تقاضا، اور اگر نہ پہنچے تو شکایت نہ فرمائیں۔ میں دوستوں کی خدمت گزاری میں کبھی قاصر نہیں رہا۔ اور خوشی، خوشنودی سے کام کرتا رہا"۔

اس عبارت کا ہر جملہ ظاہر کر رہا ہے کہ یہی وہ اعتذار ہے، جسے غالب نے دوسرے اخبارات میں نقل کرنے کی استدعا کی تھی، اور اسی بنا پر انہوں نے سیاح کو لکھا تھا "بھائی! تم نے اخبار اطراف و جوانب میں میرا حال دیکھا ہوگا"۔ دوسرے اخبار والوں نے اس اعتذار کو چھاپا یا نہیں، اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا، لیکن صاحبانِ اخبار سے استدعا کرنے کا یہ طریقہ اس زمانہ میں رائج تھا۔ چنانچہ نیّرِ راجستھان میں تذکرۂ مظہر العجائب کا جو اشتہار چھپا تھا، اس میں بھی اسی طرح استدعا کی گئی تھی۔ "اور اہلِ مطابع اس اشتہار کو اپنے اپنے اخبار میں درج فرمائیں"۔ عبارت بالا کا دوسرا حصہ خاص مقصدِ اعتذار پر روشنی ڈالتا ہے۔ نیز ساری عبارت میں تخاطبِ شخصی و انفرادی نظر نہیں آتا۔ ایک بات یہ بھی کہی جا سکتی تھی کہ اس میں نہ تو آغاز میں القاب اور نہ خاتمہ میں سلام وغیرہ، لیکن چونکہ غالب کے ایسے خط بھی موجود ہیں، جن میں یا تو القاب نہیں یا خاتمہ میں سلام وغیرہ نہیں ہے، اس لئے ہم اس کو دلیل نہیں بنا سکتے، لیکن جو اقتباس اوپر دیا گیا ہے وہ صاف غمازی کر رہا ہے کہ یہ جملے اعتذار کے علاوہ اور کسی سے متعلق نہیں ہیں اور بالکل آخری حصہ دیکھئے:

"اگر کسی صاحب کو میری طرف سے کچھ ملال
ہو تو خالصاً للہ معاف فرمائیں۔"

پس اگر یہ خط ہوتا تو لفظ "کسی صاحب" کا یہاں موردِ ہی نہیں تھا۔ اسی طرح ابتدائی جملے:

"اطراف و جوانب سے خطوط آتے ہیں۔ ادھر سے بھی ان کے جواب لکھے جاتے ہیں۔ جو اشعار واسطے اصلاح کے آتے ہیں، بعد اصلاح بھیج دئے جاتے ہیں۔۔۔۔ لیکن صاحبانِ بلادِ دُور دست کیا جانیں میرا حال کیا ہے؟"

بھی قابلِ غور ہیں۔ ان میں بھی عمومیت کا رنگ ظاہر ہے۔ جس سے اندازِ اعتذار ہی ہویدا ہے۔ پس امورِ بالا کے پیشِ نظر، میں اس کو غالب کا وہی اعتذار خیال کرتا ہوں جس کی خبر خود غالب نے سیاح کو دی تھی۔ یہ تو تھی اعتذار کی کیفیت، اس کا اثر بھی غالب کے حق میں خاطر خواہ نہ ہوا۔ ان کے عقیدت مند انہیں خط بھی لکھتے رہے اور اشعار بھی اصلاح کے لئے بھیجتے رہے، حالانکہ وہ معذور و مجبورِ محض تھے۔ سیاح کو ۱۱ جون ۱۸۶۷ء کے خط میں اپنی حالتِ زار لکھی ہے:

"بھائی! میرا حال اسی سے جانو! کہ اب میں خط نہیں لکھ سکتا۔ آگے لیٹے لیٹے لکھتا تھا، اب رعشہ و ضعفِ بصارت کے سبب وہ بھی نہیں ہو سکتا جب یہ حال ہے تو کہو صاحب! میں اشعار کو اصلاح کیوں کر دوں؟ اور پھر اس موسم میں کہ گرمی سے سر کا بھیجا پگھلا جاتا ہے۔ دھوپ کو دیکھنے کی تاب نہیں۔ رات کو صحن میں سوتا ہوں۔ صبح کو دو آدمی ہاتھوں میں لے کر دالان میں لے آتے ہیں۔ ایک کوٹھری ہے اندھیری، اس میں ڈال دیتے ہیں۔ تمام دن اس گوشۂ تاریک میں پڑا رہتا ہوں۔ شام کو پھر دو آدمی بدستور لے جا کر پلنگ پر صحن میں ڈال دیتے ہیں۔"
(خطوطِ غالب ص ۴۴۹)

غرض ۱۸۶۷ء اسی عالمِ معذوری و مجبوری میں بسر ہوتا ہے۔ اب لکھنے سے بالکل معذور تھے۔ اگر کوئی آ گیا تو کچھ لکھوا دیا۔ ۱۸۶۸ء کے آغاز ہی سے موت کے لئے چشم براہ تھے۔ ۲۷ جنوری ۱۸۶۸ء کے خط میں حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھتے ہیں:

"تم میری بات پوچھتے ہو، لیکن میں کیا لکھوں! انگلیاں کہنے میں نہیں۔ ایک آنکھ کی بینائی زائل جب کبھی کوئی دوست آ جاتا ہے تو اس سے خط کا جواب لکھوا دیتا ہوں۔ مشہور ہے یہ بات کہ جو کوئی اپنے کسی عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے۔ موتیٰ کی روح کو اس کی بو پہنچتی ہے۔ ایسے ہی میں بھی سونگھ لیتا ہوں غذا کو۔ پہلے مقدارِ غذا کی تولوں پر منحصر تھی، اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پر تھی، اب دنوں پر ہے۔ بھائی! اس میں کچھ مبالغہ نہیں ہے، بالکل میرا بھی یہی حال ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔" (خطوطِ غالب ص [illegible])

ذکا، سیاح، احمد حسن مودودی، جنوں بریلوی وغیرہ سے تو محض آشنائی اور خط و کتابت ہی تھی۔ انہیں غالب ناتواں کی حالت کا صحیح علم بھی نہ تھا۔ یہ حضرات، جوشِ عقیدت سے مجبور ہو کر لکھتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں نواب امین الدین احمد خاں والئ لوہارو تو غالب کی حالت سے بخوبی واقف تھے۔ گہرے ہمدردانہ مراسم کے علاوہ قرابت قریبہ بھی تھی، مگر وہ بھی غالب سے ایسی حالت میں کلامِ تازہ کے طلبگار ہوتے ہیں۔ ۳۰ مارچ ۱۸۶۸ء کو انہیں جواب دیا ہے:

"اے میری جان! کس وقت میں مجھ سے غزل مانگی کہ میرے واسطے نکیرین کے جواب دینے کا زمانہ قریب آ گیا۔ میرا حال اب جس کو دریافت کرنا ہو، وہ اہلِ محلہ سے دریافت کر لے۔" (نقوشِ مکاتیب نمبر)

اسی خط کے ساتھ ایک غزل بھیجی ہے جس کے شعر بقول غالب نہ شاعرانہ اور نہ عارفانہ ہیں۔ مطلع ہے:

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

یہ ساٹھ سال سے زیادہ کا ریاض ہی کارفرما ہوا، جو ایسی حالت میں بھی فرمائش پوری کر دی۔ ورنہ ۲۶ر اپریل ۱۸۶۸ء کے خط بنام غلام بابا میں اپنی زبوں حالی کا نقشہ بایں الفاظ لکھوایا ہے:

"آگے اتنی طاقت باقی تھی کہ لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا، اب وہ طاقت بھی زائل ہو گئی۔ ہاتھ میں رعشہ پیدا ہو گیا۔ بینائی ضعیف ہو گئی۔ متصدی نوکر رکھنے کا مقدور نہیں، عزیزوں اور دوستوں میں سے

کوئی صاحب وقت پر آگئے، تو میں مطلب کہتا گیا وہ لکھتے گئے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ کل آپ کا خط آیا، آج ایک دوست میرا آگیا۔ یہ سطریں لکھوادیں۔۔۔۔ امراض جسمانی اور اخلاص ہمدگر کی شرح کے بعد ہجوم غمہائے نہانی کا ذکر کیا کروں؛ جیسا ابر سیاہ چھا جاتا ہے، یا ٹڈی دل آتا ہے۔ بس اللہ ہی اللہ ہے۔"

(خطوط ص ۴۱۸)

۱۵ر جون ۱۸۶۸ء کے خط میں نواب رامپور کو بھی یہی حالت لکھوائی ہے۔

ایسی حالت میں کہ ضعف جسمانی نے انتہا کو پہنچ کر بالکل نکما بنا دیا ہو، اور موت کا عالم قریب ہو۔ ایک شاعر کے دل میں یہ خیال ضرور گزرتا ہوگا کہ جس طرح اس نے دوسروں کے مرثیے لکھے، اس کا مرثیہ بھی کوئی لکھے۔ کسی زمانہ میں غالبؔ نے لکھا تھا:

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مرگیا غالبؔ آشفتہ نوا کہتے ہیں

مگر ان آخری ایام میں سید مقبول عالم مارہروی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ایک شعر میں نے بہت دن ہوئے کہہ رکھا ہے اس خیال سے کہ میرے بعد کوئی میرا دوست میرا مرثیہ لکھے اور اس شعر کو بند قرار دیجیے، ترکیب بند رقم کرے۔ وہ شعر یہ ہے۔

رشک عرفی و فخر طالبؔ مرد
اسد اللہ خان غالبؔ مرد

دو صاحبوں کو اس کام کے واسطے اپنے ذہن میں ٹھہرایا ایک تو نواب مصطفےٰ خاں، سو انہوں نے شعر کہنے سے توبہ کی۔ دوسرے نواب ضیاء الدین خاں، وہ اکثر بیمار رہتے ہیں اور شعر بہت کم کہتے ہیں۔ پس اب میں اپنے پیر و مرشد جناب عالم صاحب سے اس عنایت کا امیدوار ہوں کہ یکا غذ اپنے پاس رہنے دیں اور وقت پر ترکیب بند لکھیں۔ اللہ اللہ اللہ۔" (خطوط ص ۲۵۴)

صاحب عالم مارہروی نے اس شعر پر ترکیب بند لکھا یا نہیں، اس کے متعلق تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ مولانا حالیؔ نے ایک ترکیب بند اسی شعر پر لکھا ہے، جو فی الحقیقت ایک عمدہ مرثیہ ہے۔

آخری ایام میں یہ مصرع: "اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے" وردِ زبان رہتا اور اکثر یہ شعر بھی پڑھا کرتے،

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

اسی عالم میں جب انہیں خبر ملی کہ نواب رامپور نے مفتی صدر الدین کی تجہیز و تکفین کے لئے ان کی زوجہ کو پانسو روپے بھیجے ہیں، تو غالبؔ کی یہ امید اپنے مقام پر بجا تھی:

"فقیر کو بھی توقع ٹھہری کہ میرا مردہ بھی
بے گور و کفن نہ رہے گا۔" (خطوط غالب ص ۶۴)

مگر، "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!" افسوس غالبؔ سا صاحب کمال تمام عمر آشفتہ حال رہا۔ گویا "لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط" کا مصداق حقیقی۔ اور جس نے اپنے اس شعر کے مطابق:

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اپنی زندگی کے آخری ایام انتہائی مصیبت اور پریشانی میں بسر کئے۔ چراغ سحری کی مانند، آخر کار ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء (۲ر ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ) دوشنبہ کو، بوقت ظہر، یہ یکتائے روزگار، اس دنیائے ناپائدار میں اپنی زندگی خوش و ناخوش گزار کر، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

"آہ غالبؔ بمرد"

اس مایہ ناز ادیب و شاعر کا مردہ بے گور و کفن تو نہ رہا، مگر اس میں نواب کلب علی خاں والی رامپور کی عطا کو کوئی دخل نہ تھا۔

حرفے مزن ز غالبؔ و رنجِ گرانِ او
کو بے معارض و بپر کاہش گرفتہ ایم

★

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

رگِ سنگ

اکبر علی خان

غالب کی بہت سی تصویریں ملتی ہیں، جعلی بھی اور اصلی بھی، مصوروں
ر نقاشوں کے فنی نمونے بھی اور کیمرہ کی مرہونِ منت بھی۔ غالب کے ہم عصروں
لاً، ذوق، مومن، آزردہ وغیرہ کو کیمرہ کی نعمت میسر نہ آ سکی اور یہ شرف
ں مرزا نوشہ ہی کے مقدر میں لکھا تھا کہ کیمرہ کی آنکھ نے ان کی شبیہہ کو
ی نہ کسی طرح اسیر کر ہی لیا۔ یہ عکس مرزا کی وفات سے ڈیڑھ دو ماہ قبل
گیا تھا۔ گو اُن کی حالت یہ تھی کہ پلنگ سے اُٹھ نہ سکتے تھے، اٹھنا بیٹھنا
ب دوبھر تھا، طشت چوکی بھی پٹی سے لگا دی گئی تھی۔ ایسے چل چلاؤ کے
ت فوٹو کھنچوانا ــــ جو اس ابتدائی دور میں کافی جانگسل مرحلہ ہوتا تھا،
ب لطیفۂ غیبی سے کم نہ تھا۔ بہرحال کسی خوش ذوق نے انہیں سہارا
ے کر کرسی پر بٹھا ہی دیا اور یہ عکس تیار ہو گیا اور ہم تک پہنچا۔

غالب کی ان بہت سی تصویروں میں دو تصویریں زیادہ معروف ہیں
، سکہ رائج الوقت کی مانند ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو ڈاکٹر ذاکر حسین نے
ی جرمن نقاش سے بنوائی تھی اور جس میں مولانا حالی کے بتائے ہوئے
ئے سے بھی استفادہ کیا گیا تھا۔ اس تصویر میں ذاکر صاحب اور جرمن
ش دونوں کی متخیلہ کو بھی کچھ دخل ہے یہ تصویر دیوانِ غالب کے جیبی سائز
ے جامعی ایڈیشن میں طبع ہو چکی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تصویر بڑی پرکشش
ہے۔ بازار میں جو تصویریں ملتی ہیں وہ یا تو اس کی بھونڈی نقالی ہیں یا
ں در نقل۔

دوسری تصویر وہ ہے جو دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) میں بھی
مل ہے۔ یہ تصویر اس سے قبل سر عبدالقادر کے مرتبہ جیبی دیوانِ غالب
شریک ہوئی تھی۔ سر عبدالقادر کو یہ تصویر لالہ سری رام دہلوی (مؤلف
خانۂ جاوید) سے ملی تھی۔ لالہ سری رام غالب کے شاگرد، لالہ پیارے
آشوب کے بھتیجے تھے۔ میں نے جس فوٹوگراف کا ذکر کیا ہے یہ وہی
۔ یہی غالب کی صحیح ترین تصویر سمجھنی چاہئے۔

غالب کے بُشرہ سے بھی ان کی انفرادیت، فطانت اور براقی طبع جھلکتی ہے۔ انہیں اپنا تاتاری خون بھی بہت عزیز تھا اور ایران کی سرزمین، زبان اور معاشرت کے دلدادہ رہتے تھے بلکہ خود اپنا کہا ہوا اردو کلام بھی ان کو اپنی نگاہ میں نہ جنچتا تھا اور کلام فارسی کے مقابلے میں بے رنگ نظر آتا تھا۔ ایران سے اس دلی لگاؤ کا ذکر انہوں نے جابجا بڑے فخر و انبساط کے ساتھ کیا ہے۔ یوں بھی وہ اپنی وضع قطع میں مغلوں اور ایرانیوں کے مشترک نمائندے تھے۔ وہ تھے بھی خوبصورت، قد و قامت اور رنگ روپ ہر حیثیت سے پُرکشش، سرو آسا قد اور چمپئی رنگ والا یہ مغل کلاہ پاپاخ و عبائیں (جو ریشمیں اور منقش ہوتی ہوں گی) کیا کچھ نہ بن جاتا ہوگا اور پھر اس پر مستزاد، دو آتشہ کی عطا کردہ گرمی اور چمک!

بہرحال یہ عظیم فنکار جہاں اپنے ذہن و فکر کے اعتبار سے نمایاں و ممتاز تھا وہاں اپنی شخصیت و وجاہتِ ظاہری میں بھی ایسی خصوصیات کا حامل تھا جو اپنی طرف بڑی شدت سے متوجہ کر لیتی ہیں۔ چنانچہ اگر ایک طرف اس کے اشعار کو رنگ و روغن کے ذریعے مصور کیا گیا ہے، تو دوسری طرف خود اس کی تصویریں بھی کئی اعلیٰ درجہ کے عالمگیر شہرت رکھنے والے مصوروں نے اپنے تخیل کے سہارے بنائی ہیں۔ چغتائی اور ستیش گجرال کی تصاویر یادھر چند ہی سال کے دوران بنی ہیں اور ان دونوں مصوروں کی مخصوص فنی خصوصیات کی حامل۔

برسبیلِ تذکرہ، غالب ہی اردو کا پہلا شاعر ہے جس پر ایک فلم بنانے کی گنجائش نکل سکی۔ بہر نوع، اس ساری مقبولیت کے باوجود ابھی تک غالب کا پیرہن کاغذی ہی تھا۔ کسی سنگی فنکار نے اسے اپنا موضوعِ کار نہ بنایا تھا۔ یہ امر موجبِ مسرت ہے کہ میرے ہی حلقۂ احباب میں ایک ایسا آذر بھی نکل آیا جس نے غالب کو مجسمہ میں تبدیل کر دیا۔ یہ فنکار ــ طاہر ایم۔ سعید (پیار کا نام نادر) ــــ میرا ہم سبق اور لڑکپن کا ساتھی ہے۔ اس نے مجسمہ تراشنے کے دوران تمام متداول تصویروں کو

دیکھا۔ اصل و نقل کے فرق کو جاننا اور غالب شناسی کے سلسلے میں جس قدر استفادہ کر سکتا تھا وہ کیا۔ یہ تصویریں اس کے سامنے تھیں۔ غالب کے نقوش اور خط و خال کی ساری خصوصیات کو اس نے پرکھا۔ غالب کے موروثی و نسلی امتیازات کو بھی نظر انداز نہ کیا۔ آخر عمر کی اضمحلالی کیفیت و بیچارگی بھی اس مجسّمہ میں منتقل ہو گئی ہے ۔۔۔ ان تمام باتوں کے باوجود ظاہر اس مجسّمہ کو "غالب" کہنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اسے "کلاسیکی شاعر" کہنے پر مصر ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ فنکار کو اس عنوان پر کیوں اصرار ہے، بہرکیف عنوان کچھ بھی ہو غالب پھر غالب ہے۔ اس کی عظمت اس عنوان سے بھی ظاہر ہے اور جو مجسّمہ تخلیق ہوا وہ غالب کے سوا اور کون ہے؟ اگر فنکار کا جذبہ یہ ہو کہ دوسرے عظیم شعرا کو بھی اس "تجسیم" میں نمائندگی دے دی جائے تو کچھ برا نہیں۔ یوں "کلاسیکی شاعر" ہونے میں بھی وہ اوصاف آ جاتے ہیں جو ہم غالب سے منسوب کرتے ہیں اور جن کا کامل احاطہ آسان نہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا غالب کی یہ سنگی شبیہہ تیار کرتے ہوئے فنکار نے غالب کی شخصیت کا بغور مطالعہ کیا تھا اور اس نے ان خصوصیات کو پوری گرفت میں لیا تھا جن کی وجہ سے غالب ایک تہذیبی علامت بن گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ان کا یہ نالہ پابندِ نے بھی نہیں رہا اور چند ایسی باتیں بھی شامل کر دی ہیں جو فنکار کے زاویۂ نظر کا حکم رکھتی ہیں۔ فنکار اپنے موضوع کو کس کس زاویہ سے دیکھتا ہے، اس پر یوں بھی کوئی قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔

سیّد نے یہ مجسّمہ یونانی مجسّموں کے اسلوب پر بنایا ہے جسے اصطلاحاً "اکیڈیمک" کہتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ کلاسیکی شخصیتوں کے لئے یہی اسلوب مناسب بھی ہے کیونکہ وقار و تمکنت کو اسیر کرنے کے لئے اس اسلوب کی روایات آذر کی رہنمائی بھی کرتی ہیں اور مدد بھی۔ مگر سیّد نے مشرقی مزاج و ماحول کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور مجسّمہ بنانے کے وقت ایک بین بین راستہ اختیار کیا ہے تاکہ مجسّمہ میں اجنبیت کی جھلک نہ دکھائی دے۔ مثلاً آپ بالوں کی ترتیب میں یونانی حکماء کی ہلکی سی جھلک پائیں گے تو آنکھوں میں وہ متانت و وقار کی اور شعاع بھی نظر آئیگی جو غالب سے مخصوص اور اس کے فنی مظہر سے متوقع ہے۔ عمر کی رعایت سے آنکھوں کے نور میں دھیما پن بھی ہے گویا چراغ کی لَو روشن تو ہے، مگر داغِ فراق صحبتِ شب نے خوشی کی سرحد سے قریب پہنچا دیا ہے!

سیّد نے یہ کام اپنے عام اندازِ کار سے مختلف طور پر کیا ہے کیونکہ اس کے دیگر مجسّمے کلاسیکی یا "روایتی" موضوعات و اسلوب سے متعلق نہیں ہیں۔ اس کی خلاقانہ صلاحیت نے دوسرے روپ اختیار کئے ہیں۔ سیّد رامپور کے ایک بت شکن گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ وہ چودھری، سدھیر خستگیر اور دھرنہا پاترا جیسے مشہور استادوں کا شاگرد رہا ہے۔ اس نے لکھنؤ کے آرٹس اینڈ کرافٹس کالج سے باقاعدہ سندِ فن بھی حاصل کی ہے۔ اس کے فن کی نمائشیں کئی جگہ ہو چکی ہیں اور مجسّموں کی تصاویر اخباروں میں شائع ہوتی رہی ہیں جنہیں نقادانِ فن نے سراہا ہے۔ ذاتی طور پر وہ نمود و نمائش کا شوقین نہیں بلکہ خودستائی سے بھی نفور ہے، مگر فنکار کی روایتی بے پروائی اس میں بھی موجود ہے۔

سیّد نے مجسّمہ سازی کے علاوہ نقش نگاری بھی کی ہے۔ وہ تجریدی خطوط اور گہرے و بسیط رنگوں کا شائق و گرویدہ ہے۔ اس کے موضوع زیادہ تر انسانی دل کی دھڑکنیں ہیں۔ فن کے عظیم فن پاروں کو دیکھنے کے لئے اس نے پورے برصغیر کا کونہ کونہ چھان مارا ہے۔ وہ پاکستان میں موہن جودڑو، ہڑپہ، اور ٹیکسلا کے سرچشموں کو دیکھ چکا ہے۔ ہند میں ایلورا، اجنتا اور ایلیفنٹا کے غار دیکھے ہیں۔ سانچی، کوہ آبو، غرض جہاں جہاں فن کی نمود ہے وہ سیّد کی نگاہ سے گذر چکی ہے۔ جیسے جیسے عمر میں اضافہ ہوگا اس کے فنی تجربات اور صناعانہ فتوحات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جائے گا جس کی ہمیں پوری توقع ہے!

★

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

عندلیب گلشن ناآفریدہ

عبدالغنی شمسؔ

تری رفعتِ فکر کے آگے یہ گنبدِ نیلگوں
محض اک نقطۂ بے نشاں
جہت اور تعیّن کے امکاں سے عاری
بسانِ فغانیؔ و بیدلؔ تو کرتا رہا فکر کے موقلم سے
سدا لعبتانِ تخیّل کی صورت نگاری
ورق در ورق، تیرے ذہنِ فسوں کار نے وہ طلسماتِ معنیٰ سجائے
جنہیں دیکھ کر نقشِ تصویر بن جائیں بہزاد و مانیؔ
کچھ اس طرح سے تو نے اذہانِ انساں کے کھولے دریچے
کہ پائی شعور و خرد نے نئی تابناکی

تری شوخیوں ہیں وہ البیلا پن جس سے لذت کشِ سرخوشی زندگانی
تو ادراک کہنہ حقائق کی اُن پیچ در پیچ راہوں سے تھا آشنا
جن کی ضو سے تھی روشن نگاہِ فلاطونؔ و سیناؔ
اسی آگہی سے بنا اپنے فن میں یگانہ
اُفق در اُفق تیری تخئیل دائم پر افشاں
گہے شعلہ ساماں، گہے شبنم افشاں
تری کاوشوں سے ہوئی تنگنائے غزل بحر ساماں

رہا دشتِ مقصد میں تو پا بہ جولاں.
رکھا تجھکو سعیٔ بقا نے پریشاں
تجھے پیار تھا کس قدر زندگی سے
مگر پھر بھی تو راہ دیکھا کیا موت کی، حسرتوں سے
صلہ کیا ملا، تجھکو لیلائے فن سے وفا کا
تو ٹھہرا قتیل اپنی طرزِ ادا کا
ہمیشہ رہا شکوہ سنجِ زمانہ
لکھا تو نے اپنے جگر کے لہو سے ستم رانیٔ زندگی کا فسانہ
ولیکن ترے درد کو یہ لہو سرد دُنیا نہ سمجھی
ترے خواب گلشن، پہ ناآفریدہ!

حوادث کی وہ روز و شب بے کراں سنگ باری
شکستوں سے چور آئینہ آرزو کا،
پھر بھی کیا ہے ترا آئنہ — فن کا آئینہ،
روشن ہے — اک آفتاب منوّر
جو چشمِ ہنر میں ابد آشنا ہے

سخن ایجاد

فضا ابن فیضی

کتنی ہشیار تھی "طبعِ سخن ایجاد" تری

تو نے غزلوں کو نئی رو، نیا آہنگ دیا

چشمِ انجم کی طرح ذہن رہا باز ترا

آنکھ جھپکا نہ سکا "شعلۂ آواز" ترا

تو نے اس ساز کو چبھتا ہوا آہنگ دیا

دیکھنا ہو جو "گل افشانیِ گفتار" تری

تیرے آگے کوئی "پیمانۂ صہبا" رکھ دے

"رگِ تاک و خطِ ساغر" ہے تری موجِ نظر

تو وہ "خود بین و خود آرا" کہ ترے زانو پر

فرقِ ناز اپنا "بتِ آئینہ سیما" رکھ دے

"بوئے پیراہنِ جاناں" کا رہا جب نہ دماغ

"غمِ آوارگیٔ بادِ صبا" کیا ہوتا

شفق و قوسِ قزح، سبزہ و گل، ابر و ہوا

خود تری ذات تھی اک موجِ محیطِ صہبا

تجھ سے بے مہریٔ ساقی کا گلا کیا ہوتا

وہ تری سرخوشیٔ عشق ترا ذوقِ نشاط

رہ گئے درد و الم شعر و ترنّم بن کر

تو نے کھینچی ہے مہکتے ہوئے اشکوں سے شراب

تو نے چہرے کی خراشوں سے کھلائے ہیں گلاب

نالہ آیا ترے ہونٹوں پہ تبسّم بن کر

"دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذّتِ درد

کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا"

لے گئی تجھ کو کہاں شوخیٔ ذوقِ غمِ دل

"بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا"

وہ تری نکتہ رسی، فلسفیانہ تخئیل

تو نے آفاقیتِ فکر کی گرہیں کھولیں

پھوٹی پڑتی ہے ہر اک لفظ سے احساس کی ضَو

نوکِ خامہ ہے تری یا کسی قندیل کی لَو

تو نے شبنم کی ترازو میں شعاعیں تولیں

تیوروں کی وہ حرارت، لب و لہجہ کی وہ آنچ

ایک تصویر ہے تو سوزِ ہنرمندی کی

کہیں تخئیل کا ابلاغ، کہیں فن کا شعور

تجربے کی کہیں حدّت، کہیں جذبے کا سرُور

تو نے کس ڈھنگ سے غزلوں کی چمن بندی کی

تیرا جالاک تخیل کسی کوندے کی لپک

فن ترا آئینہ جذبات کی صناعی کا

وہ دریچوں سے معانی کے بلاغت کی نمود

وہ ترے سرمدی افکار کا پُرجوش سرود

ساز منہ چوم لیں آواز کی گیرائی کا

اب بھی اک درس ہے اربابِ بصیرت کیلئے

تیرے اس مطلعِ عالی کا حکیمانہ شعور

"بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا"

تیرے ادراک کا آئینہ ہے آئینۂ طور

تیرا ہر شعر ہے آذر کدۂ فکرِ بلیغ

تونے لیلائے تخیل کے سنوارے خد و خال

تیری شوخی ہے حنابندِ سرِ انگشتِ غزل

"عودِ ہندی" کے ہیں روشن تری محفل میں کنول

حالی و شیفتہ ٹھیرے ترے گلچینِ کمال

تونے مستانہ کیا طے رہِ وادیٔ خیال

کون سی راہ ترے قدموں سے گلزار نہیں

ہمدمِ بادِ صبا ہے روشِ فکر تری

انجمن بھر سے جدا ہے روشِ فکر تری

ہم سخن فہم ہیں، کچھ تیرے طرفدار نہیں

شبنم بہ گل لالہ

(فارسی غزلیات)

غالب
مترجم: قاضی یوسف حسین

کیا کہا یہ غم درونِ سینہ جاں فرسا ہے، ہے
چپ ہیں لیکن جانتے ہیں حق پہ دل اپنا ہے، ہے
بات تو سچ تھی مگر آئی نہ لب پر زینہار
کہہ دیا خود تم نے محبوبوں کا دل خارا ہے، ہے
آنکھ سے دل تک وہ غم سے خون ہو جانے کی بات
گر کہوں یہ اس کی پہلی موجۂ دریا ہے، ہے
دیکھا کیسے انتقامِ خستگاں لیتے ہیں، ہاں
ہم جو کہتے تھے کہ ہر امروز کا فردا ہے، ہے
اپنی خواہش کیا، وفا کیا، پھر بھی پرسش میں خطا!
تم جو کہتے تھے کہ خواہش در وفا بیجا ہے، ہے
پہلے پوچھو خود سے تم کیسے ہو، پھر مجھ سے کہو
بخت ہے ناساز، ہاں - اور یار بے پروا ہے، ہے
یار کی خو آپ جائیں ورنہ وضع حسن میں
زلف عنبر بو۔ وہ ہے اور عارضِ زیبا ہے، ہے
صبر اور تیری طرف سے یہ کہاں حد بشر!
پر جو کہتے ہیں بظاہر گرمِ استغنا ہے، ہے
عشق اور وہ بھی کہ طوفانِ بلا کہیئے جسے
اس کے باعث سب شکوہِ دلبری عنقا ہے، ہے
دیدہ و دل رہ گذر میں تیری فرشِ راہ ہیں
جلوہ گہ میں تیری جانبازوں کا جو غوغا ہے، ہے
شورش آگیں نظم بھی اور شورش افزا نثر بھی
یہ جو کہتے ہیں کہ غالب شاعرِ یکتا ہے، ہے

سحر طلوع ہوئی پھول کھلتے ہیں، مت سو
جہاں جہاں گل نظارہ چلتے ہیں، مت سو
مشامِ شوق شمیم آشنائے لالہ و گل
ہوا کے مشک فشاں جھونکے چلتے ہیں، مت سو
یہ دادِ حسن طلب ہو، صراحیاں چھلکیں
مئے شبانہ کے قطرے ٹپکتے ہیں، مت سو
ستارۂ سحری مژدہ سنج صد دیدار
فسونِ چشم فلک اڑتے چلتے ہیں، مت سو
تو محو خواب ہے اور آسمان پر تارے
دہانِ صبح سے افسوس کرتے ہیں، مت سو
یہ شکل نالہ نفس ہے تمام تر سنبل
مژہ بہ گریۂ خوں لالے چلتے ہیں، مت سو
نشاط گوش سراسر صدائے قلقل ہے
پیالے پینے کی رہ کیسے تکتے ہیں، مت سو
نشانِ زندگیٔ دل ہے دوڑنا، مت ٹھہر
نظر کے آئینے مس سے جھلکتے ہیں، مت سو
یہ آنکھیں، ان کا ہے کیا صرف غیرِ نظارہ؟
یہ دل جبھی ہیں کہ جب تک دھڑکتے ہیں، مت سو
بہ ذکرِ مرگ ہے شب کے گزارنے میں مزا
بہم فسانۂ غالب کو سنتے ہیں، مت سو

کس نے کب وہ شے مانگی ہے جس کو دلِ فلک نہ چاہا
ظرفِ فقیہہ نے مے نہ چاہی، اپنی مے نے گزک نہ چاہا

ڈوبنے والا موج میں ڈوبا، پیاسے نے پانی پی ہی لیا
کسی کو زحمت اس نے کب دی، راحت کو بیشک نہ چاہا

جاہ و حشم کو علم سے مطلب، علم کو جاہ و حشم سے کام
تیری محک نے زر کو نہ دیکھا، میرے زر نے محک نہ چاہا

شحنۂ دہر نے جو بھی چھینا، اس کو کبھی لوٹا یا بھی ہے؟
کاتبِ بخت نے جو بھی لکھا، اس کو کرنا حک نہ چاہا

خونِ جگر تھامے کی جگہ، اور اپنی مستی بن پیالے
نالۂ دل تھا اپنی نوا اور ساز نے زخمہ تک نہ چاہا

بحث و جدل کو چھوڑ سراسر، میکدہ کی رہ دیکھ کہ اس میں
کسی نے کی کوئی بات جمؔ کی؟ کسی نے ذکرِ فدکؔ نہ چاہا

بیٹے کی رہ تکتے تکتے بوڑھی آنکھیں ہوئیں سفید
شوق کی راہ میں پتلی کو بھی ساتھی ایک پلک نہ چاہا

گودڑی اچھی میرے تن پر، ایسا پردہ سخت ہی اچھا
عشق نے غم کے خار و خسک میں پیراہن کو تنک نہ چاہا

رند اور رند ہزاراں شیوہ، طاعتِ حق سے کیوں کتراتا؟
لیکن بت بھی کیسا بت تھا، سجدے میں اک مشک نہ چاہا

اس نے جانو آساں سمجھا، عجز کا اس میں کیا مذکور؟
گر غالبؔ نے داد کی خاطر شکوہ خلافِ فلک نہ چاہا

بادۂ مشکبو مرا، بید و کنارِ کشت بھی
کوثر و سلسبیل بھی، سدرہ بھی اور بہشت بھی

بسکہ ہے تیرا غم ہی غم میری سرشت میں نہاں
مصدرِ فتنہ ہائے چرخ ہے مری سرنوشت بھی

حسرتِ وصل سے غرض سرخوشیٔ خیال میں؟
ابرِ بہار اگر تھمے، ہے لبِ نہر کشت بھی

نورِ خرد بہ آگہی، خواہشِ تن کا نغمہ سنج
وقفِ زقوم حادیہ، نامیۂ بہشت بھی

خشم و عتاب سے ترے غیر ہو دور کیا سبب
جب کہ رہینِ ہر غضب اپنی ہے سرنوشت بھی

ترکِ خودی ہو برملا، لب بہ انا الصنم ہوں وا
محرمِ گیر و دار کب اپنے ہوئے کنشت بھی

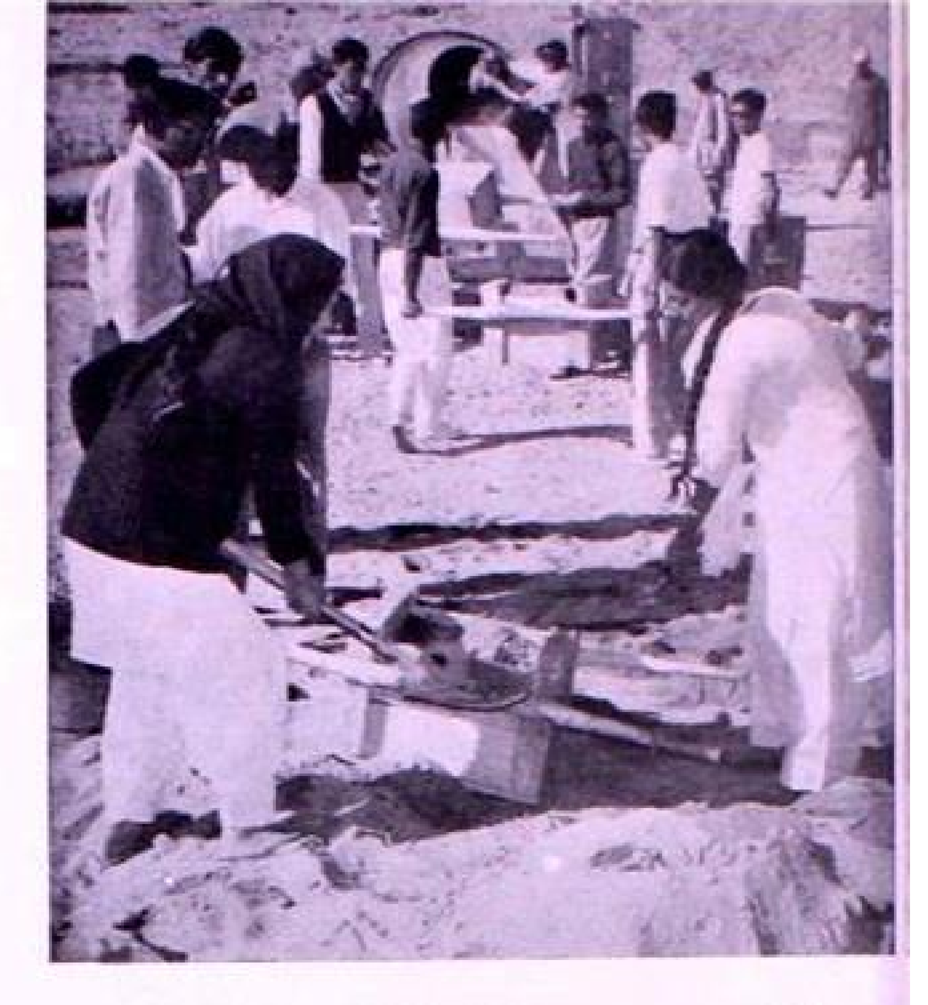
اتنی دعائیں بے شمار، بر سرِ صد ہزار خم
رکھیں جو زیرِ آفتاب، بادہ فشاں ہے خشت بھی

بادہ حرام ہی سہی، بذلہ نہیں خلافِ شرع
خوب پہ خوش نہیں، نہ ہو موردِ طعن زشت بھی

غالبِ خستہ یہ غزل عرض بحکمِ حسرتی
اتنے ہی میں ہے شادماں طبعِ وفا سرشت بھی



خیر سگالی : صدر پاکستان کا حالیہ دورۂ سیلون ۔ (صدر پاکستان
وزیر اعظم سیلون، مسز بندرا نائکے — مشترکہ اعلان پر دستخط)

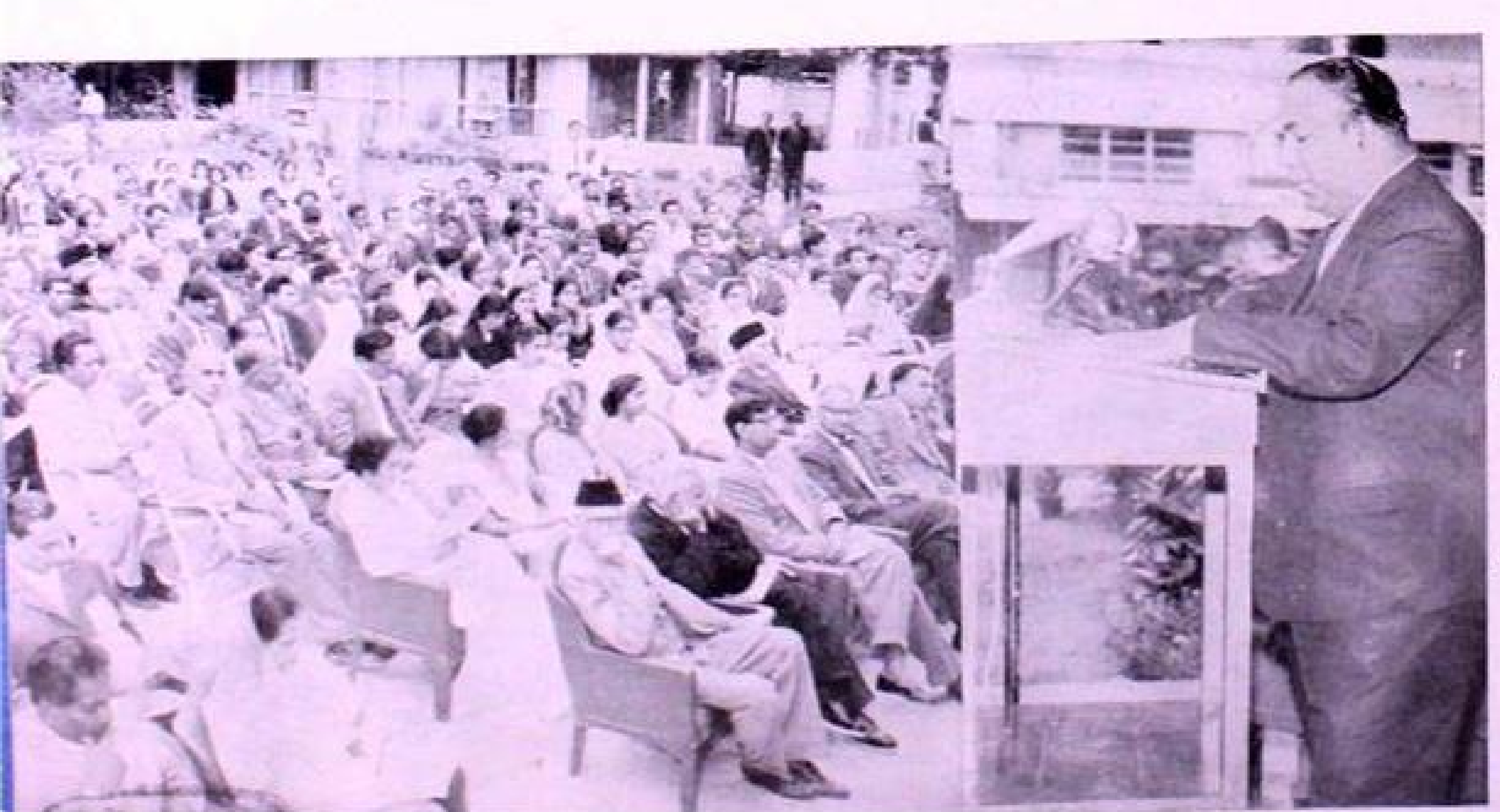


قومی یکجہتی : مشرقی پاکستان کے طلبہ اور طالبات
اسلام آباد کے تعمیراتی کاموں میں عملاً شریک ہیں

آفتاب آثار



صدارتی اعزاز : (دائیں سے بائیں) : جناب عبدالمنعم خان، گورنر مشرقی پاکستان (ھلال پاکستان)، ڈاکٹر ایس، ھدایت اللہ (ستارۂ امتیاز)،
جناب صفی الدین احمد (نقاشی)، جناب ابوالفضل (بنگلہ ادب)، جناب عباس مرزا (کھیل)



کل پاکستان جغرافیہ کانفرنس
(کراچی)

افتتاح :

جناب اے ۔ ٹی ۔ ایم مصطفیٰ

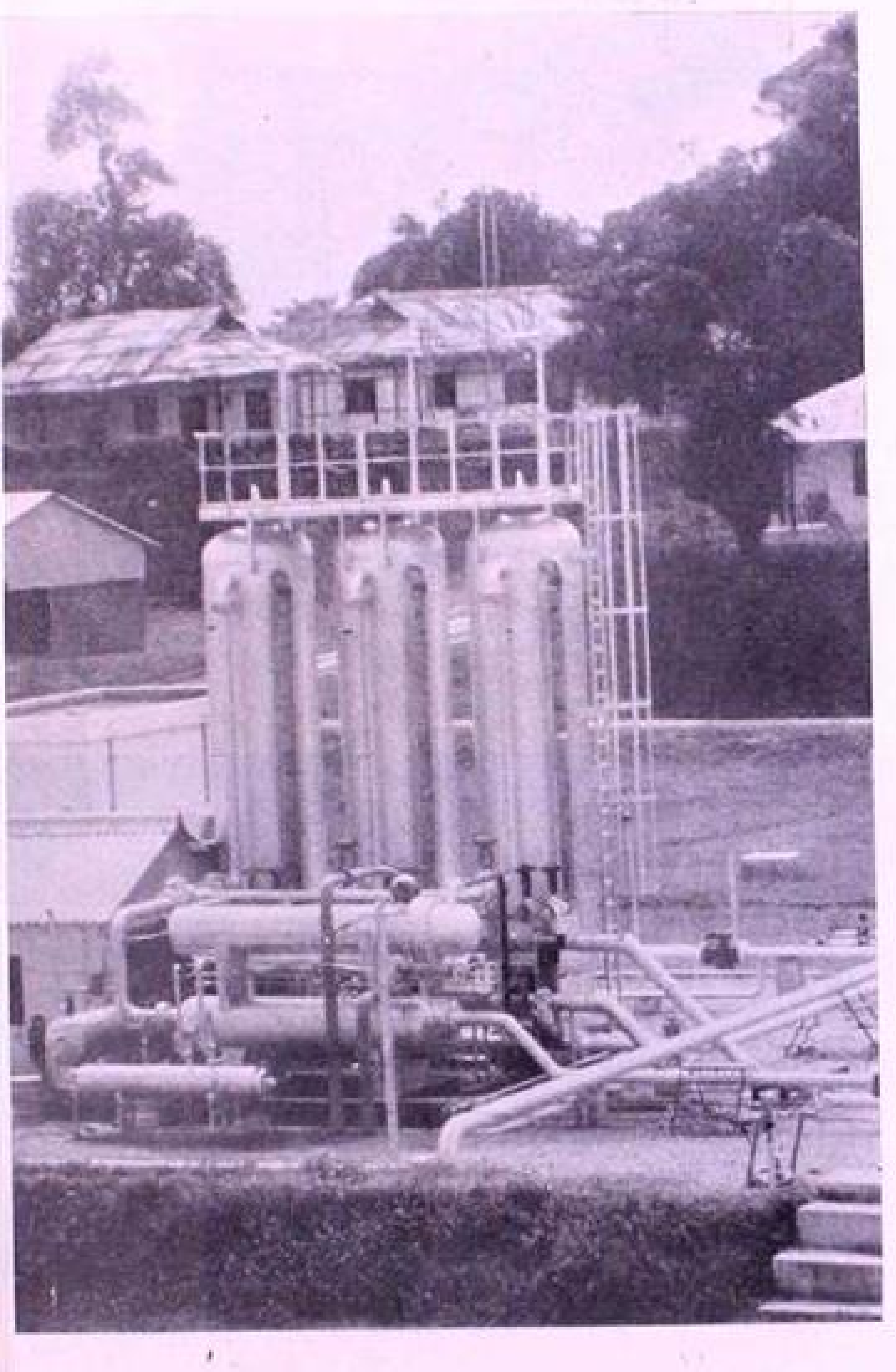
شعلۂ جوالہ

(قدرتی گیس: حرارت و توانائی کا نیا سرچشمہ)

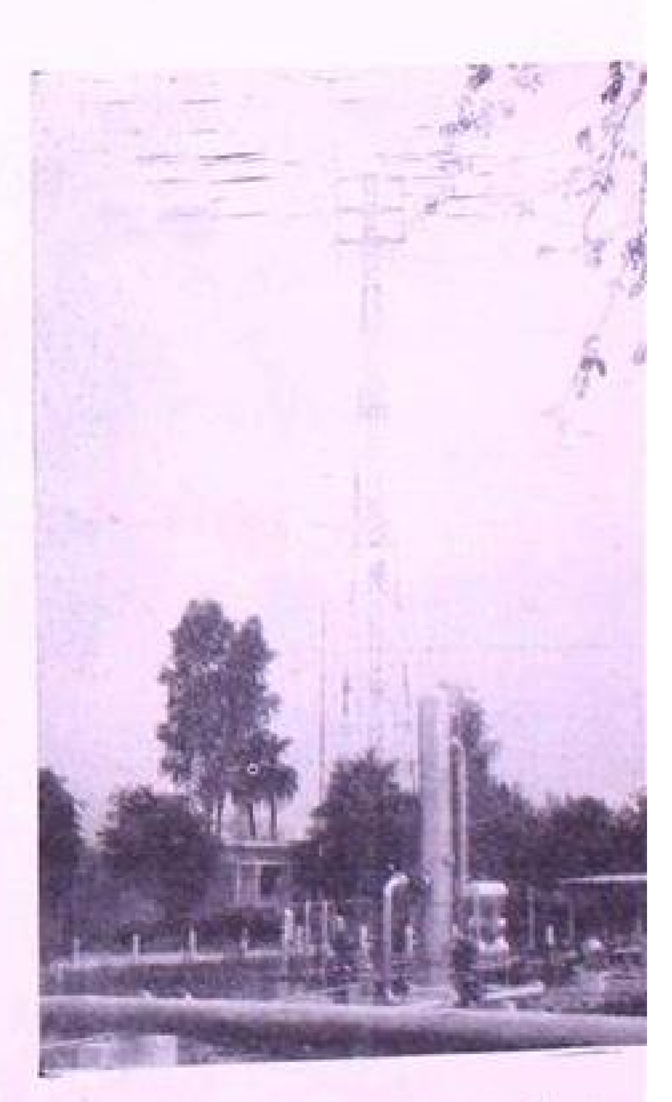
مغربی پاکستان: سوئی (بلوچستان)

مشرقی پاکستان: چھتک، سلہٹ

سوئی گیس: (ذخیرہ گھر، کراچی)



قدرتی گیس سے کیمیاوی کھاد (کارخانہ، مشرقی پاکستان)



سوئی گیس کا ذیلی اسٹیشن (روہڑی)



سوئی میں سب سے پہلا
دریافت شدہ سرچشمہ

افسانہ:

"رنگ و بُو"

(ایک افسانوی تمثیل)

شہاب رفعت

"توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے"۔ مگر "ہمت" کے معنی کیا ہیں؟ غالب نے ایک اور جگہ بھی تو کہا ہے کہ — "ہوا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے"۔ اگر 'ہمت' کے وہی عرفی معنی ہیں یعنی بلند حوصلگی، تو اس سے عالم آباد ہوگا نہ کہ برباد۔ مثنوی "رنگ و بو" کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے 'ہمت' کا مفہوم واضح ہوتا ہے۔ "ہمت ترک دادنِ دنیا"۔ جیسا کہ دیوان نظیری محشی مطبوعہ نولکشور کے ایک حاشیے میں تحریر ہے۔ (اور وہاں تو "تحریر" کے معنی بھی حاشیہ تصویر بیان کئے گئے ہیں) اور اسے تصوف کی اصطلاح بتایا گیا ہے۔ اس سے یہ عقدہ وا ہو جاتا ہے کہ عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے کیوں آباد ہے۔ اس لئے کہ "ترک دنیا کرنے والے" اہلِ ہمت نہ ہوں گے تو لازماً وہ ہوں گے جو اہلِ ہمت نہیں ہیں — یعنی اہلِ ہوس۔ جن کے دم سے دنیا آباد ہے۔ اس طرح وہ قطرہ جو آنکھوں ہی میں رہا۔ وہ دنیا سے دور — عزلت گزیں — رہا۔ جبھی ہم اس کی یہاں تک قدر و منزلت کرتے ہیں کہ اسے آنکھوں میں جگہ دیتے ہیں۔ اس کے بعد اُن بے شمار شرحوں پر غور کیجئے جن میں "ہمت" کو محض ہمت، یعنی حوصلہ ہی قرار دیا گیا ہے۔ غالب نے پہلے تمثیلی کہانی، اور پھر مفصل تشریح، سے اس کا اصطلاحی مفہوم پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ (ر۔ خ)

کہتے ہیں کسی زمانے میں ایک بلند اقبال، جواں دولت بادشاہ تھا، جس کی ذات بہمہ وجوہ قلمرو ہند کے لئے غازۂ رخسار کی حیثیت رکھتی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ ایک ایسا شاندار خُم تھا جو مستیٔ دل کی مے سے لبریز ہو۔ رشحۂ فیض سے اس قدر تر دست کہ اس پر ایک قلزمِ بے پایاں کا گماں ہو۔ اربابِ غرض کی تمنائیں بے پایاں تھیں گو اس کا خوانِ کرم بھی اتنا ہی وسیع تھا — اور ایک دنیا اس کے بارانِ فیض سے سرشار تھی۔ یوں سمجھ لیجئے گویا اس کا پیکرِ جلیل جود و سخا کا آئینہ دار تھا، بلکہ جود و سخا خود اس کی ذات ہی سے معرضِ وجود میں آئے تھے۔ یہ بادشاہ بلند اقبال ہمیشہ لوگوں کی حاجات پوری کرنے کے لئے کمربستہ رہتا۔ یہاں تک کہ وہ خود نقصان اٹھا کر دوسروں کو بہرہ مند کرنے میں سرگرم رہتا۔ ابرِ دریا بار کے آغوش کی طرح پھولوں کانٹوں سب کو شاداب کرنے پر تیار — اس قدر فیاض کہ اس کے ہاتھوں کے سامنے بادل بھی کفش بر دوش نظر آتا۔ اس کے ہاتھوں کی طوفانی گہر افشانیوں سے ستارہ در ستارہ آسمان بھی سیلی زدۂ موج سراب ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں پر بارانِ کرم کرنے کے لئے وہ لعلوں پر لعل اور موتیوں پر موتی بکھیرتا۔ صبح کے وقت جب وہ تخت پر مسند نشیں ہوتا تو اس کا سنہری تاج موجِ شفق سے گلنار ہو جاتا۔ اس سراپا مہر نے چار دانگ عالم میں جود و کرم کی صلائے عام دے رکھی تھی اور اس کی ہر موجِ نفس لطف و عنایت ہی کی پردہ کش اور زمزمہ سرا تھی۔ اس کی شانِ عطا کو دیکھتے ہوئے حاجتمند لوگ، سرگرمِ تلاش، جوق در جوق اس کے پاس آتے۔ اس کثرت سے جیسے دامانِ کہسار پر لالے ہی لالے نمودار ہوں۔

قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ اربابِ طلب کی ان صفوں میں ناگاہ افراتفری کی ایک صورت پیدا ہوئی اور اس نے مضبوطی سے جڑ پکڑ لی۔ ایک بدبخت حریف پیدا ہوا جس نے دودِ آہ کی طرح اس کی بارگاہ معلّٰی میں سیاہی ہی سیاہی پیدا کر دی۔ یہ شخص کیا تھا، محض گودڑی پوش فقیر جس کی نوبت آفات کے زہر ہلاہل نوش کرتے کرتے یہاں تک پہنچ چکی

تھی کہ خوش بختی نے اس کو ٹھوکریں مار مار کر بے حال کر دیا تھا۔ اس کا دل رنج و مصیبت کی آنچ سے جل جل کر کوئلہ ہو چکا تھا۔ جس پر راکھ ہی راکھ کا غلاف چڑھا ہوا ہو۔ اس کے اعضا و جوارح کیا تھے، راکھ کا تودہ، سر سے پاؤں تک آشوبِ نگاہ۔ کسی وقت بھی اسے بختِ بد کے ہاتھوں چین کی نیند نصیب نہ ہوتی تھی اور اس کا چہرہ، تمام تر گردِ سفر سے آلودہ، سراسر اظہارِ شکست کا آئینہ دار پھٹی پرانی گودڑی اپنے گرد لپیٹے اور ہاتھ میں کجکول لئے۔ گودڑی بھی ایسی جس کے ہر شگاف سے کوئی پرانا غم جھانکتا ہو۔ رنج و مصیبت کی بلائیں اس کی تحریر سے سراپا گرد و غبار اور بُوم شوم کا سایہ اس کے مقابلے میں محض جزوِ ضعیف۔ اس کی تیرہ بختی کو دیکھتے ہی نگاہوں میں یوں لگتا جیسے اس کے جگرِ سوختہ کا دھواں اس کے سر پر ایک پردہ بن کر معلق ہو گیا ہو۔ اور اس کجکول کے اندر۔ کسی دیو کا مغز گداز ہو کر اس میں پانی بن جائے۔ یا پھر خون دل اس میں بادۂ ارغواں کا روپ دھارے ــــ اس کی آشفتہ خرامی نے نگاہوں کا زہرہ آب کر دیا تھا اور سماعت اس کے نظارہ سے آتشکدۂ راز بن گئی تھی۔ وہ اٹھا اور اس نے چشمِ تماشا پر گرد بلا ڈال دی اور اس کی آواز شکایت کے آہنگ میں یوں بلند ہوئی:۔

"اے بادشاہ عالی مقام! میں کوئی فقیر نہیں ہوں۔ اور نہ عطا و بخشش کا طلبگار۔ میں تو صرف جنوں کے طرۂ پریشاں کی شانہ آرائی کرتا ہوں اور آپ کے ہاتھ صرف اپنا سامان بیچنے آیا ہوں۔ اس لئے کہ آپ نے اپنے جود و سخا کا بآوازِ بلند اعلان کیا ہے اور آپکی صلائے عام کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا ہے۔ ممکن ہے جو سامان میں لایا ہوں وہ بارگاہِ عالیہ میں شرفِ قبول حاصل کرے۔ اور میرے اوقات حضور کی بدولت بہتر ہو جائیں۔"

جب بادشاہ نے اس کا مدعا دریافت کیا تو بے تامل کہا لاؤ اپنی یہ گودڑی اور کجکول میرے حوالے کر دو۔ اس نے وہ گودڑی لے لی اور اسے بے اندازہ دولت بخشی۔ گویا اس نے سائے کے عوض اسے خورشید عالمتاب کی تابانیاں عنایت کر دیں۔ وہ بیچنے والا سب مال و دولت لے کر رخصت ہو گیا۔ اور خریدار نے وہ سامان خزانچی کے حوالے کر دیا۔ اس نے کہا اچھا ہے یہ دولت میرے خزانے میں رہے جیسے کہ دل کا موتی سینے کے صدف میں پنہاں ہوتا ہے۔ یہ مت سمجھو کہ ہم نے اس مصیبت زدہ شخص سے گودڑی اور کجکول خریدا ہے،
بلکہ ہم نے اپنے لطف و کرم سے اس کا دل رکھا ہے ٹھیک ہے ہم انسان ظاہری مال و دولت پر کیا کچھ ناز نہیں کرتے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو جو لوگ صاحب نظر ہیں ان کی نگاہوں میں دل ہی دل ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہاں اس کا اچھی طرح دھیان رکھو کہ اصلی چیز صرف دل ہی تو ہے۔

غرض جب آفتاب عالمتاب نے دن کے رخسار پر پردہ ڈال دیا اور آسمان سرمئی چادر کی گودڑی پہنے خستہ حالت میں بھیک مانگنے کو نکلا۔ ایسے کہ جستجو کی گلیوں کے پیچ و خم میں گھومتے ہوئے شام اس کے لئے گودڑی تھی اور چاند کجکول، تو بادشاہ نے نو آسمانوں کا اطلس زیب کئے ہوئے اپنے حرم کی خواب گاہ میں آرام کیا۔ یہ وہ عالم تھا جب گوشۂ خلوت نے اس سے پیغامِ استراحت پایا اور نیند کے بچھونے نے اس سے آسودگی پائی۔ یہ نیند کا عالم! اس کی آنکھیں بیٹھے خواب میں کھو گئیں جیسے کسی نے مئے ناب کے طوفان میں رس گھول دیا ہو۔ اس مستئ خواب میں اس کی نگاہیں رنگا رنگ تماشے دیکھنے لگیں اور ناگہاں پردے سے ایک صورت نمودار ہوئی۔ اس کی نگاہوں نے کیا دیکھا کہ کسی حور وش کا سراپائے جمیل بروئے کار آیا اور اس نے جیبِ شہود میں جلوہ ہائے رنگ رنگ کے پھول ہی پھول بکھیر دئے یوں لگتا تھا جیسے نور کا کوئی علم بلند ہو گیا ہو یا کوئی پردہ رنگیں پھولوں سے لبریز ہو۔ ایک ایسا دلفریب پیکر جس نے تمام تر حسن و لطافت سے طرح پائی ہو اور جس میں سر تا پا شفاف بلور پاروں کی براقی و آبداری جمع ہو گئی ہو۔ جس راستے سے وہ چلتی تھی پھولوں کے جلوے مشعلیں لئے آگے آگے راستہ دکھلاتے اور ہما کا فال و فر بھی اس کے راستے میں گرد و غبار کی حیثیت رکھتا ہو۔ نگاہوں میں اس کے باغ و بہار رخساروں کی شوخی و رنگینی سے یوں لگتا تھا جیسے ان سے باغ ہی باغ پھوٹ پھوٹ کر نکل رہے ہوں۔ اس پیکرِ نگاریں نے بادشاہ کے دامن میں پھول ہی پھول بکھیر دئے اور پھر اپنے تارِ ساز سے رخصت کا نغمہ بلند کر کے نگاہوں سے روپوش ہونے لگی۔

بادشاہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس کی حقیقت معلوم کرنا چاہی۔ اس نے کہا اے کہ تو میرے لئے مژدۂ جاں فزا ہے مجھے یہ تو بتا کہ تو کون ہے اور یہ سب تکلیف کیسی؟ یہ ودیعتِ فطرت کی آئینہ پردازی کیا ہے؟ اس نے جواب دیا "اے بادشاہ! میں تیری دولت و مال ہوں۔ تیرے جاہ و جلال کی آئینہ دار۔ میں

وہ ہوں جس سے شمع طرب شناسائے راز ہے۔ بزمِ نشاط کی روشنی میرے
ہی دم سے ہے۔ میں تیرے نشان کا سایہ ہوں۔ تیرے
ہی اقبال کی دلآویز صورت۔ اس گودڑی کی بُو سے میرا ناک میں دم آگیا ہے
اور میرے چراغ کو بادِ صرصر کے تھپیڑوں نے بجھا ڈالا۔ بس بس! اس مصیبت کدہ
میں کہ دنیا ہے، اب مجھ میں رہنے کی تاب نہیں رہی۔ میرے سامنے ایک وسیع
لق و دق بیاباں ہے کہ اس میں منہ اٹھا کر نکل جاؤں ـــــ لے دیکھ! اب
میں تیرے دستِ ستم سے آزاد ہو گئی۔ اب خدا ہی تیرا نگہبان ہو۔"

بادشاہ کی بلند ہمتی نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ اس سے رک جانے کا
تقاضا کر کے سبک سر ہو۔ اس لئے اس نے اس کی عربدہ پردازی کی
کوئی پروا نہ کی۔ اس نے اس کی مرضی پر سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے جانے کی
اجازت دے دی۔ اس نے بڑی خندہ پیشانی سے اس کو الوداع کہی۔

اس کے جاتے ہی ایک اور بجلی بادشاہ کے دامنِ ہوش پر گری۔
ایک اور طلسمی پیکر کا جلوہ اس کی نگاہوں پر آشکار ہوا۔ ایک گرانڈیل
شخص، کوہ گراں سے بھی زیادہ تنومند جس سے الوند بھی عرقِ شرم میں غرق
ہو جائے۔ ایک ایسا پہلتن، پیل پیکر جس کی شان و شوکت کی نمود کے لئے
گردن کی رگیں عظیم الشان پہاڑوں کے مغز سے نمودار ہوئی ہوں۔ اس کی
وہ چین جبیں جو قہر و غضب سے شمشیر زن ہو اور تلوار کی تیزی جسم و جاں
کی خوش بختی کے لئے سامان شورش۔ ایک زبردست رند، قوی دست،
قوی ژال، قوی برز جو حریف کو پیغامِ شکست دے۔ اس کے جاہ و جلال
کو جم و کے کا سر و سامان میسر اور رستمِ سیستان کی سی ہمتی سے بہرہ ور۔
اس نے کہا" اے بادشاہ! میں تیری طاقت و توانائی ہوں۔ تیرے
دست و بازو کی تاب و تواں۔ اگر میں سرکش ہوں تو کیا۔ میرا توانا پیکر
تیرا حلقہ بگوش ہے۔ میری فطرت لاکھ آتشیں سہی مگر میں تیرے سامنے
سراپا آب ہوں۔ میری پشت تیری بلند اقبالی کے لئے مژدۂ جانفزا سے
قوی تر ہے۔ مگر گودڑی اور کجکول ـــــ معاذ اللہ! یہ تو طالع ناسازگی
کی علامت ہیں۔ اس لئے اب میں کہاں اور تو کہاں۔ تیرے بغیر میرا
نام و نشان کیا۔ میرا شمار تیرے بدبختوں میں کیوں ہو؟"

یہ کہہ کر پہلی پری پیکر جدھر گئی تھی اس کے پیچھے وہ بھی پر پھڑپھڑاتا
ہوا چلا گیا۔ چونکہ اس فتنہ و آشوب سے بادشاہ کی بلند حوصلگی دور نہیں
ہوئی تھی۔ بیشک اس کی تاب و تواں تو رخصت ہو گئی تھی، لیکن دل نہیں
گیا تھا۔ اس لئے اس پردہ سے پھر ایک تجلی نمودار ہوئی اور شاہ کی آنکھوں
میں ایک سیلِ نور امڈ آئی۔ اس پری پیکر کی موجِ نفس میں پھولوں کی
خوشبو بسی ہوئی تھی۔ گویا وہ ایک ایسی دلآویز ہستی تھی جس کا سرمایہ
ترکیب جوہرِ جاں ہو۔ ادائے ناز سے اٹھایا ہوا دامن ہاتھ میں، اور
ہر پلک کے جھپکنے سے اس کو نیا بال و پرواز حاصل ہوتا تھا۔ چہرہ خونناب
جگر سے دُھلا ہوا۔ تمام تر پردۂ دل سے آشکار۔ ایسا رندِ سیہ مست کہ
جب وہ بادہ نوش ہو تو دونوں جہاں کا خون اپنے ساغر میں انڈیل لے۔
از خود رفتگی اس کے کفش برداروں میں اور بیخودی اس کی خراج گذار۔
ایسا جلوہ پیرا جس کی تجلی برقِ نظارہ ہو۔ اور برق اس کے پیکرِ رعنا کا
دلآویز عکس۔ پھولوں کی رنگینی اس کے خال و خد کا عکسِ جمیل اور موج
پری اس کی خوبیٔ رفتار کا جوہر۔ جلوۂ جنت اس کا غبارِ راہ اور چشمۂ کوثر
اس کے بحرِ بیکراں کا قطرۂ ناچیز۔

نشہ تو خیر شراب ہی میں ہے لیکن اس نشے کا رگ و پے پر
چھا جانا اس ہی پر موقوف تھا۔ بیشک خون کی آمد جگر ہی سے ہے لیکن
اس کی روانی تمام تر اسی کے دم سے تھی۔ یہ پیکرِ ناز بادشاہ کے دل میں
ولولہ افگن ہوئی۔ ایسے کہ اس کے پہنائے نظر میں ایک قیامت برپا
ہو گئی۔ اس نے کہا میں تیرا ہی آئینۂ ناز ہوں۔ میں تیری ہمت ہوں جو
آفاق گداز ہے۔ میں تیری درگاہ تک کتنی ہی دور سے چل کر آئی ہوں،
تجھ سے رخصت ہونے کی اجازت لینے۔"

بادشاہ نے اس کی التماس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور
بڑی نازبرداری سے اس کا دامن تھام لیا۔ اس نے کہا" افسوس! یہ
تم کیا کر رہی ہو۔ آخر تم کس کی مطیع ہو کہ مجھ سے یوں گریز کرتی ہو؟ تمام
بیم و امید کے تردد سے آزاد ہو کر معمولی گودڑی کے لئے خزانہ لٹا دینا، کسی کی
پریشانی کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے بیچارے درویش کا دل رکھنا، دولت و
اقبال کو نظر انداز کر دینا اور آئینے کو یوں راستے میں پھینک دینا، قسمت
کے پیچھے جان و دل بلکہ تاب و تواں سے بھی دستبردار ہو جانا ـــــ یہ سب
بلند پروازی کس کے دم سے تھی؟ تیرے ہی دم سے۔ یہ آہنگِ کمال کی شوخیٔ
طرازی تیری ہی بدولت تھی۔ اب میں جس کا تیرے سوا اور کوئی نہیں رہا،
تیرا دامن ہاتھ سے کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ تیری محبت کی جڑیں میری رگ
رگ میں پیوست ہیں اور میرے استخواں میں تیرا ہی مغز پنہاں ہے۔ میری
شبِ تاریک کی شمع بھی تو، چراغ بھی تو۔ میں کیا ہوں مشتِ خاک اور تو
میرا سامانِ بہار۔ دیکھ! میری سرزمین پر یوں تباہی کی بجلیاں مت گرا۔
میری طبیعت کو آتشِ حسرت سے جلا کر خاک سیاہ مت کر۔ اے کہ تجھ سے
دونوں جہانوں کے کام درست ہوتے ہیں۔ تو نہ ہو تو پھر باقی رہیگا ہی کیا؟
ہمت کا تو تقاضا ہی یہ ہے کہ نو کے نو آسمانوں کی کرسیاں اس کے زیرِ پا ہوں
پھر وہ سائل کا خراب و خوار ہونا کیسے گوارا کرے اور جو شخص سراپا عجز ہو کر

آئے اس کے سامنے دروازہ کیسے بند کردے؟

اس پری وش نے بادشاہ کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور اپنے حسنِ خداداد سے پھول ہی پھول بکھیر دئیے۔ اس نے امید کے دامن میں غمزہ و ناز و ادا کے پھول ڈال کر اسے اپنی خوشنودی کا مژدہ سنایا۔ اس نے کہا:-

"اے بادشہ! تُو اب تک غم کی کوفت سے آزاد رہا۔ میں تجھ سے خوش، تو مجھ سے خوش۔ جان و وفا تیرے دم سے سلامت۔ میرا جلوہ تیرے لئے غازۂ رخسار۔ دولت و اقبال ہمیشہ تیرے غلام۔ تاب و تواں تیرے لئے بادۂ جام کیونکہ یہ سب میرے ہی دم سے زندہ و سلامت ہیں۔ بلکہ یہ سب میرے جود و سخا کی بدولت برقرار ہیں۔ کیف و مستی کے بال و پر کس سے ہیں؟ صہبا سے۔ قطرہ کی دستگاہ کس سے ہے؟ دریا سے۔ میری صورت سراسر آزادی اور میرا کام مردانگی و لطف و کرم۔ تو بھی میری ہی طرح آزاد و سبک بار ہو جا۔ سب کچھ دے ڈال اور اس کے عوض کچھ بھی نہ خرید۔ دروازہ بن اور راہِ وفا پر کھلا رہ۔ اور دل کی راہ میں خانہ برانداز ہو جا۔ اپنے دل میں دل آزاری سے ڈر۔ خزانہ لٹا دے اور کرم پیشہ بن جا۔ بخت کی یاوری اور کرامت تیرے ہی دم سے ہیں۔ تو جاوداں رہ کہ تیری ہی بدولت سلامتی ہے۔"

اے غالبِ فسردہ دل و جاں، آ۔ رندوں کی صفوں میں بے سروپا ہی داخل ہو۔ بے خبروں کو خبر سے نواز۔ اور اس بادۂ دیرینہ سے دوسروں کو بھی کچھ دے۔ وہ تیرے پردۂ ساز کا اثر، وہ زمزمۂ خارا گداز، وہ جنونِ پردہ کشا، وہ ولولۂ زنجیر خا، وہ نفسِ نالہ فگند، وہ نگۂ جلوہ پسند کیا ہوئی؟ تو ہوسِ جاہ میں ڈوب گیا۔ افسوس! تو کنوئیں میں جا گرا۔ تو ابلیس کے فریب میں آ کر راہ غلط کر کے ریو و ریا کے راستے پر گامزن ہے۔ جب سے تو نیرنگ و فن کے پیچھے پڑا ہے۔ تو اپنی نظر سے گر گیا ہے۔ مال و زر کا غلام ہونا اہرمنیت ہے۔ اے مردِ خدا! بتا یہ کیسی خدا دشمنی ہے؟ افسوس یہ تیری دنیا طلبی اور تیرے یہ ابرام، یہ تقاضے۔ وہ جو پہلے گرمیٔ خوں تھی، وہ اپنے آپ کو زیر کرنے پر صرف تھی۔ تیرے دل میں آتشِ ہنگامہ شعلہ زن تھی تیرے دل میں بتانِ مغاں شیوہ کا داغ تھا۔ سودائے محبت کے پیچ و خم میں کبھی تیرے معاملات زلفِ بتاں کی طرح درہم برہم تھے۔ تیرا دن شام سے بھی زیادہ تاریک تھا۔ اس لئے یہ داغِ دلِ ایام تھا۔ تیری آنکھ ہر طرف سے پریشان تھی اور تیرے لئے ہر رہگذار پر جلوے محوِ خرام تھے۔ یہ جلوے اپنے پیچھے فتنے ہی فتنے چھوڑتے جاتے تھے۔ اس لئے آنکھ ہر جگہ سپر انداز ہو جاتی۔ ان تمام زمانوں سے جو گزر گئے اور ان خونابہ فشانیوں سے اب جو کچھ نظر آتا ہے وہ کیا ہے؟ — شاہد، شعر، شراب، شکر۔ آسمان کئی کئی دن ایسے ہی حرکت کرتا رہا۔ افسوس! اس عمر پر جو ایسے گزری۔ یہ تیری تباہ حالی اور اس روسیاہی کے ساتھ۔ یہ تیری دیوانگی و جہالت۔ یہ ناکامی و بے حاصلی۔ وہ بدمستی و تن پروری۔ وہ شعبدہ بازی اور افسوں گری۔ وہ تیری بے راہ روی۔ وہ تیری ہرزہ خرامی۔ وہ جوشِ جنوں میں اپنے خرمن کو آگ لگانا۔ وہ دامِ ہوس کے حلقوں میں گرفتاری وہ سب کیا تھا؟ خون؟ اور یہ خاک۔ وہ مرض، یہ ہلاکت۔ وہ کیا روش تھی اور یہ کیا ارادہ؟ وہ سب پوچ تھی۔ یہ سب ہیچ۔ تیری آدھی عمر خواب میں گزر گئی اور آدھی چاند کی مساحت میں۔ دیکھ! اس کارگاہِ پیچ در پیچ میں تیری سعی و کوشش کا ماحصل کچھ بھی نہیں۔ بالفرض تجھے تمناؤں کا سرمایہ ہاتھ آ گیا، بادشاہی میسر آ گئی۔ اے تو کہ تمام تر وسوسہ ہی وسوسہ ہے۔ اس سے فائدہ؟ یہ دنیا کیا ہے؟ سراب — تیرا اپنا وجود کہاں ہے؟ جو چیز بھی اس پردہ سے آشکار ہے وہ محض پرِ عنقا کا نقش و نگار ہے۔ کالعدم ہے ہستیٔ اشیا سراسر غبارِ فنا ہے۔ اک سیمیا کی سی نمود۔ یہ مخلوق۔ اس کی نمود محض وہم ہے۔ تیرے وہم ہی نے یہ فرض کر لیا ہے کہ اس کا وجود ہے۔ دیکھ! وہم کی ہرگز پیروی مت کر۔ ذرا حقیقت کے گریبان سے سر باہر نکال۔ منصور کی طرح اور ہی نعرہ بلند کر۔ اپنی ہستی کو ٹھکرا دے۔ خواہ تو خلق کو روس سمجھے یا روم۔ جو کچھ بھی ماسوائے حق ہے وہ معدوم ہے۔ جو کچھ بھی اس پردۂ کائنات میں متصور ہے، صرف ہمت عالی ہی کی بدولت ہے۔ ساقیٔ ہمت جو دنیا کو صلا دیتا ہے وہ خمخانۂ الٰہی سے شراب فراہم کرتا ہے۔ توفیقِ الٰہی رقم پرداز ہے۔ وہ اس رقم پر جو غیرِ حق ہو خطِ تنسیخ کھینچ دیتا ہے۔ اگر تیری ہمت پر کشا ہو تو مولا بھی ہما بن جائے۔ اگر تائیدِ ایزدی کا آفتاب طلوع ہو تو عجب نہیں کہ انگاروں سے لالے ہی لالے پھوٹ پڑیں۔

ہماری ہمت بھی تو شہودِ حق سے عبارت ہے۔ ہم جو کچھ بھی سوچتے ہیں وہ سر بسر وجودِ حق ہے۔ ہماری ہمت غیرتِ حق ہے اور بس۔ اور ہماری کثرت تمام تر وحدت۔ سبحان اللہ! کلام میں سطوتِ حق کے اثر سے الفاظ میرے ہونٹوں سے محوِ فرار ہیں۔

غزل

عبداللہ خاور

عارض پہ موجِ رنگ، ابھر کر، بکھر گئی
شاید قریب ہو کے تمنا گذر گئی

ربطِ خفی سے اٹھتی ہے رُخ پر حیا کی موج
یعنی نگاہِ یاس بڑا کام کر گئی

آنکھوں پہ رشک کرتے، جو رکتی کبھی نگاہ
رُخ پر پڑی نظر تو قدم پر بکھر گئی

آغاز ہی سے ہجر کے سائے دراز تھے
آخر کو زلفِ شامِ سیہ، تا کمر گئی

آتے ہیں گاہ گاہ، مگر اس روش کے ساتھ
جیسے ہوا کی موج، اِدھر آئی اُدھر گئی

لب تک کبھی نہ شکوۂ احباب آسکا
تہمت ہمیشہ گردشِ دوراں کے سر گئی

"آیا تھا[1] داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد"
وہ جوئے خوں چلی ہے، کہ رنگت نکھر گئی

مینا شریکِ صحبتِ اغیار، حیف حیف
اے سنگِ محتسب[2] تری فطرت کدھر گئی

اب آنکھ بند کر کے غزل کہہ رہے ہیں لوگ
"اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی"

---

[1]: تصرف

[2]: تہنیت گوئید مستاں را، کہ سنگِ محتسب
بر سرِ من آمد و ایں آفت از مینا گذشت

راغب مراد آبادی

وہ بھی ہمیں چاہیں، یہ تقاضا نہیں کرتے
رازِ دلِ محبوب کو رسوا نہیں کرتے

کیا یاد نہیں آپ کو پیمانِ محبت!
پیمانِ محبت کو تو بھولا نہیں کرتے

ہم یوسفِ کنعانِ غریب الوطنی ہیں
ہم آرزوئے حسنِ زلیخا نہیں کرتے

اظہارِ تمنا کا اک انداز ہے یہ بھی
ہم ان سے جو اظہارِ تمنا نہیں کرتے

رہتے ہیں وہی شکوہ طرازِ غمِ دوراں
جو قوتِ بازو پہ بھروسا نہیں کرتے

جو اہلِ نظر ہیں وہ سرِ جادۂ غم بھی
اپنی روشِ خاص کو بدلا نہیں کرتے

توہین ہے یہ شیوۂ تسلیم و رضا کی
ہم اُن کو مصیبت میں پکارا نہیں کرتے

جو محرمِ اسرارِ حیاتِ ابدی ہیں
دامن کو وہ آلودۂ دنیا نہیں کرتے

ہم تیری توجہ پہ بھی ہوتے نہیں مغرور
ہم تیرے تغافل کا بھی شکوہ نہیں کرتے

خلوت میں جب آتے ہیں بزرگانِ عبا پوش
کیا کیا نہیں ہوتا ہے، یہ کیا کیا نہیں کرتے

راغب ہے نظر منزلِ مقصود پہ جن کی
دورانِ سفر وہ کہیں ٹھہرا نہیں کرتے

غزل

مشتاق مبارک

ظلمت حجابِ دیدۂ بیدار بھی نہیں
لیکن طلوعِ صبح کے آثار بھی نہیں

اس دل کو یوں خراب تغافل نہ کیجیے
جو عرضِ مدّعا کا گنہ گار بھی نہیں

وارفتگانِ شوق کو جنّت سے کم نہیں
وہ راہ جس میں سایۂ دیوار بھی نہیں

اے زندگی نویدِ مسرت نہ دے کہ ہم
مجبور اگر نہیں ہیں تو مختار بھی نہیں

دنیا میں اب کہاں ہیں ہم ایسے نیاز مند
جو شکوہ سنجِ بے رخیٔ یار بھی نہیں

ان کے حضور جرأتِ گفتار کس کو ہے
ان کے بغیر لذّتِ گفتار بھی نہیں

ناآشنائے حسنِ چمن گل بدست ہیں
اپنے نصیب میں خلشِ خار بھی نہیں

اب کون ہوگا سازِ اناالحق پہ نغمہ زن
منصور بھی نہیں رسن و دار بھی نہیں

غالب کی اس زمیں میں مبارک نہ کہہ غزل
پُرپیچ اگر نہیں ہے تو ہموار بھی نہیں

ناہید نوا

تمیزِ آشنا ناآشنا کیا
یہ اندازِ شکستِ ناروا کیا

یہ ہستی خم بہ خم، بیباک پیچاک
خبر کیا مبتدا کیا منتہا کیا

ہوس تھی پھر بھی کیا، جاگا تو تھا دل
یونہی آسودہ رہنے میں مزا کیا

ہزاروں جنس گوناگوں یہاں تھی
نگاہوں نے چنا تیرے سوا کیا

نشیلی انکھڑیاں، نظریں جنوں خیز
فسوں کے رنگ بھی ہوتے ہیں کیا کیا

دلِ شوریدہ بے تابِ ازل تھا!
مریضِ جاودانی کی دوا کیا

جہاں ہر خون کی بوندیں ہوں درکار
وہاں کام آئے گا رنگِ حنا کیا

اگر خورشید ہوتا پھر بھی کیا ہے
حیاتِ اختر سیماب پا کیا

مجاز افسوں حقیقت بھی فسانہ
کرے چشمِ تحیّر آشنا کیا

ذرا سی رَو سے کیا طوفان جاگے
جو موج اٹھے تو ہوں طوفاں بپا کیا

تہِ ہر شاخ صد جوشِ بہاراں
چمن اندر چمن ہے ماجرا کیا

گنوائی دل نے ساری بات ناہید
یہ حرفِ شوق لب پر آ گیا کیا

غزل

منیر فاروقی

خلشِ دردِ نہاں ان کو دکھا بھی نہ سکوں
ایسی کچھ بات ہوئی بات بنا بھی نہ سکوں

محفلِ شوق میں دیوانگی اب ختم ہوئی
اپنی دیوانگیٔ شوق مٹا بھی نہ سکوں

نغمہ بے کیف ہوا، حسن میں وہ بات نہیں
اب کسی طور کوئی زخم سجا بھی نہ سکوں

فن کی تزئین کروں، زیست کا عنواں بدلوں
میں کہ زلف ولب ورخسار بُھلا بھی نہ سکوں

جذبہ جب شعر میں ڈھل جائے حسیں بن جائے
میری مشکل ہے کہ محفل کو جگا بھی نہ سکوں

عشق کی لاش پہ اب حسن کو روتے دیکھا
واعظِ شہر کو یہ راز بتا بھی نہ سکوں

شعر کہہ کے رخِ گیتی کو سجائے گا منیر
ایسے دیوانے کو دیوانہ بنا بھی نہ سکوں

غالب کہ بقائش باد: ــــ بقیہ صفحہ ۲۰

بقیہ صفحہ ۲۰

کرے۔ یہی تمنا اس کے خواب میں پوری ہوگئی۔

ایک اور جگہ غالب نے یہی بات دوسرے انداز میں کہی ہے:

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

غالب کا کہنا ہے کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ نالہ کرنے سے میرے دردِ دل میں اضافہ ہوجائے گا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں ہرگز آہ و زاری نہ کرتا یعنی دردِ دروں نے غالب کو نالہ کرنے پر مجبور نہیں کیا بلکہ نالہ، دردِ دروں کی افزائش کا باعث ہوا۔

جیمز لینگے کا نظریہ ہے کہ شعوری جذبات کا اظہار ہی ان کی تخلیق کا باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً حقیقت یہ نہیں ہے کہ جب ہم ڈرتے ہیں تو کانپتے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم جب کانپتے ہیں تو ڈر بھی محسوس کرتے ہیں! یہی بات غالب کے ہاں ایک نئے تیور سے آئی ہے:

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

اس شعر میں صنفِ لطیف کی صحیح نفسیات کے بیان کردی ہے:

حسن اور اس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

شاعر کا محبوب حسین ہے۔ لیکن اسے اس سے زیادہ حسنِ ظن ہے۔ اس لئے وہ اپنے عشاق کا امتحان نہیں لیتا۔ یہ تو ٹھہرے غالب کے محبوب، مگر ویسے بھی ہر صنفِ نازک کو حسنِ ظن سے تھوڑا بہت واسطہ ضرور ہوتا ہے۔

غرض غالب کی ژرف بینی اور وسعتِ نگاہ کی مثالیں ان کے کلام میں جابجا ملتی ہیں۔ ان کا دیوان گوناگوں انسانی جذبات اور تاثرات سے پُر ہے مثلاً:

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

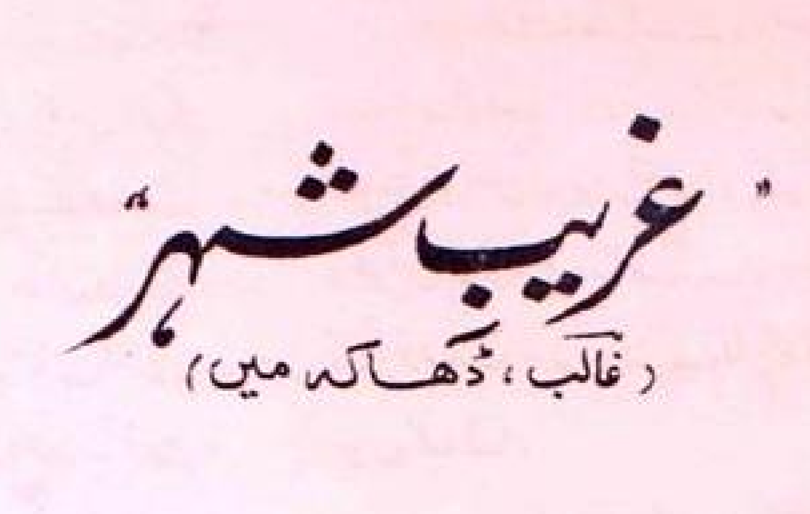
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ایک طرف نفسیات کا مطالعہ ترقی پذیر ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ غالب کی قدر بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ مگر ان دونوں باتوں کا ایک تلازمہ بھی غور طلب ہے اور اس کے لئے بھی پھر غالب کی طرف رجوع کیجئے: اس کی شوخی نے بارگاہِ خداوندی میں بھی یہ سوال پیش کر دیا تھا کہ:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

★

تصوریہ:



"غریب شہر"

(غالب، ڈھاکہ میں)

رفعت جاوید

جنّت — وہ مقام رنگ و بو جہاں بادۂ گلفام و مشکبو
[کی] فراوانی ہے، جو ہیچمیرز، اسداللہ خاں غالب کو بھی از دمِ مرگ الیٰ
[...]سین ارزانی ہے۔ حور و قصور حسب وعدۂ ایزدی ذی خویش بھی موجود
[او]ر نسیۂ عالم کی بجائے نقد جنت الماویٰ ہمہ سود۔ روز و شب راحت
[ہ]ی راحت اور لیل و نہار استراحت ہی استراحت۔ پھر بھی دلِ آشفتۂ
[غ]الب کو سکون کہاں؟ اس آتش پارہ کو تسلی بجز جنون کہاں! لوحش اللہ
[س]بزہ زار ہائے مطرّا تا حدِ نظر — تعالی اللہ! امر غزار ہائے مصفّا
[...]اپنہائے بصر۔ جو کچھ دنیائے سفلی کے خاکدانِ تیرہ میں ہے وہ چند
[ب]لکہ ہزار چند جنت الفردوس کے نورٌ علیٰ نور جزیرہ بلکہ خطیرہ میں ہے۔
[ف]ردوس کے وہ میوہ ہائے گوناگوں — آئینہ دارِ صنعت حضرت
[...]یچوں۔ مگر ہائے! اس گل زمیں میں وہ انبۂ بنگالہ کہاں — وہ
سبز فام چوں گل لالہ کہاں۔ وہ سراپا شعلۂ جوّالہ — وہ آتش کا
پرکالہ جس کے لئے خامۂ عنبر شمامہ کبھی نخل رطب فشاں ہوا تھا۔
یعنی ستائش ثمر بہشت میں یوں گرم بیاں ہوا تھا دلِ دردمند
زمزمہ سازِ نادرہ پردہ کشائے درِ خزینۂ راز ہوا تھا:

آم کا کون مردِ میداں ہے
ثمر و شاخ، گوئے و چوگاں ہے
آم کے آگے پیش جاوے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
مجھ سے پوچھو! تمہیں خبر کیا ہے
آم کے آگے نیشکر کیا ہے
آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام
شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
باغبانوں نے باغِ جنّت سے
انگبیں کے بحکم ربّ الناس
بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس

اس ستم گر، کافر ادا کی یاد میں دل صبح و مسا بے چین ہے۔
غالب حسرت زدہ کا دامنِ شوق ہے اور یہ نور العین ہے۔ اس کی
تمنا نے اس قدر ناصبور کیا دلِ وارفتہ کو شوق سے اس قدر معمور کیا
کہ ایک بار پھر عالمِ ارواح سے عالمِ اجسام کو رجوع ہونے کا خیال
دل میں سمایا۔ اور وہ جو آبِ رواں کی بہشت آئیں سرزمین ہے
اس کی سیاحت و مساحتِ سکرآفریں کا شوق چرّایا۔ مگر سوچا کہ
گو کلکتہ کا جلوہ زار از بس دیدنی ہے۔ مگر ڈھاکہ کے سبزہ زار کا امر بھی
بھی چشیدنی ہے جب اس حیزِ طبیعی یعنی عالمِ سفلی میں فروکش تھا تو
کیا کیا چرچے نہیں سنے تھے۔ اور اس جنتِ ارضی کے متعلق دنیائے
تصور ہی میں کیا کیا خواب نہیں بُنے تھے۔ اشکال و صور کی گوناگوں
گردش سے ذہن فانوسِ خیال ہو گیا تھا۔ شجر و حجر کی پُر فسوں پوشش سے
تصور نگار خانۂ جمال ہو گیا تھا۔ یہ دیارِ زریں انبہ۔ یہ کشورِ
پُر بہار دیرین پنبہ۔ اور اپنا نہیں یہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اور شب و روز لبِ جو، لبِ کشت، سیرِ باغ، سیرِ راغ جہاں
بیٹھیں مع جام، دلآرام، آم کے میٹھیں۔ نو واردانِ بساطِ ہوائے
خلد یعنی ماوراء الدہر کی زبانی معلوم ہوا کہ فرنگی بلاد و امصارِ
ہند سے رخصت ہوا اور دولتِ خداداد پاکستان کے قیام سے
"خاورِ باختر" نمونۂ جنّت ہوا۔ اس لئے کلکتہ اور اس کے مضافات
کو سرزمینِ آشوب و فساد پایا اور آفتِ جانِ بندۂ مسلم نہاد پایا

ہرچند کافر کھلا ہوں اور آدھا مسلمان، لیکن غالب سفید ریش خستہ حال ضعیف البنیان بندۂ ایمان، گبر مسلمان نما، رند پارسا۔ کہیں اس کو مسلمان سمجھ کر مردہ ہونے کے باوجود شوریدہ پشت تیغ کے گھاٹ اتار نہ دیں یعنی تیغ تعصب و جہالت سے "گول مال" نہ کر دیں یعنی مار نہ دیں۔ اس لئے ڈھاکہ، جہانگیر آباد میں کہ نو پایۂ تخت کشور بنگالہ قسمت خاوری ہے اور کشور نو زائیدہ پاکستان کا پایۂ تخت ذیلی ہے ۔۔ گلگشت کا ارادہ کیا۔ دیدہ و دل کو اس کی زیارت کا دلدادہ کیا ۔ خبر نہیں خیال کی پلک جھپکی یا کیا ہوا، ایک طیلسان طلسمی بادپا، بادپیما پر روانہ ہوا اور ناگہاں مژہ برہم زدنی میں اعلیٰ علیین سے تحت الثریٰ جا پہنچا۔ جیسے سند باد عقاب یا رُخ سے پگ بستہ کر برابر چکر پہ چکر کاٹے جاتا تھا، زناٹے سے سواد خاک پر اترا۔ انگریزی میں سواد خواں تھا ۔۔ حروف رومن کا نکتہ داں اعنی راز داں تھا۔ اس لئے اسے PIA صاف پڑھ سکا۔ پر چاہ نے اسے "پیا" تصوّر کیا اور دل نے کہا: زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا۔ معلوم ہوا پاکستان خاوری و باختری میں یہی طیلسان جدید کہ فرنگی کی پرواز کے لئے مفتاح و کلید ہے، وسیلۂ آمد و رفت بین الدولتین ہے۔ اور عالم مثل میں بھی اس کا نعم البدل رابطۂ باہمی عرش و فرش یعنی بین الساقین ہے ۔۔

الحمد للہ! کیا سواری مثل باد بہاری ہے اور کیا طرفہ اس کی تیزی و طراری ہے۔ ہائے وہ جادۂ پختہ و جلی، رُفتہ و مصفّٰی جس پر طیلسان کا ناگہاں نزول ہوا، سفر و حضر کی کلفت کا پورا پورا صلہ وصول ہوا۔ معلوم نہیں اس فقیر جنت زادہ کی آمد آمد کی خبر کس نے شائقین پُر تمکین ۔۔ کو پہنچا دی کہ خلق خدا مصافحہ و معانقہ اور خیر مقدم و پیشوائی کے لئے جوق در جوق آ موجود ہوئی اور بصد جوش و خروش نعرہ زن برورود مسعود ہوئی۔ اللہ اللہ! یہ سرزمین پاک نہاد، جادو نژاد زینۂ طلسمی سے اترتے ہی خطۂ مینو سواد پر قدم رکھتے ہی جادو کا سا اثر ہوا۔ اور یہ بندۂ حقیر پُر تقصیر جملہ رسوم و قیود کہن سے بے خبر ہوا۔ گنگی پوشید تشریف لوی اور زبان بے اختیار طرز نو میں گفتگو کرنے لگی:

غالب رسیدہ ایم بہ ڈھاکہ وا زشراب
از سینہ گرد دورئ احباب شستہ ایم

دانا ؤں نے کہا ہے: السفر وسیلۃ الظفر اور فقیر اسے سو فی صد درست یعنی سالک ثُدد پایا۔ دولتِ خداداد عوام و خواص کی خوش خلقی اور مہمان نوازی کے کیا کہنے۔ رات دعوتیں ہی دعوتیں۔ گلبانگ ناؤنوش۔ سابقہ رنگا رنگ بزم آرائیوں کے سب دفتر یک قلم گاؤ خورد ہو گئے جن کا ذکر کبھی یوں کیا تھا:

خوشا روز و شب کلکتہ و عیش متقیانش
گو رنہ مہر و مکناشن بہادر ماہِ تابانش

دعوتوں کے ساتھ ہی ساتھ مشاعروں پر مشاعرے۔ ڈھاکہ بلا شبہ کلکتہ سے بازی لے گیا۔ وہاں تو نواب علی اکبر خاں، مولوی سراج الدین علی خاں۔ قاضی القضاۃ، ماموں زاد بھائی زیک خاں، مہربانانِ فرنگ اسٹرلنگ، ولیم فریزر وغیرہ کے سوا جسے دیکھو بغضِ معاویہ میں غرق۔ وقنا ربنا عذاب النار۔

مگر یہاں تو سرزمین بھی دلکش فردوس بریں اور مکین بہشت آئیں۔ ایسا سرسبز و شاداب سوادِ اعظم اور اس میں شہر نگینے کی طرح جڑا ہوا۔ یہ رونق، یہ چہل پہل، یہ ہاٹ بازار زر کا لا مالا مال۔ شرق و غرب دونوں کے چابکدست ہنرمندوں گوناگوں بوقلموں صناعیوں کے نمونے شرقی غربی نسوانی حسن کے جلوے فراواں۔ دہلی۔ آگرہ۔ کلکتہ سب گرد! رامش و رنگ رقص و موسیقی اور ان کے شب و روز گھر گھر مظاہرے۔ چنگ چگامہ کا زور شور، واہ واہ! موسیقی و رقص کا ذوق تو خداداد ہے۔ لیکن شعر و شاعری کا شوق بھی کچھ کم نہیں۔ سب کی رگ و پے میں طاری و ساری۔ بنگلا کے ساتھ اردو اور کہیں کہیں فارسی کے شوقین بھی۔ اس لئے خوب خوب دھوم دھام کے مشاعرے۔ کلکتہ میں تو اعتذار اور صلح صفائی کی خاطر مثنوی "باد مخالف" لکھنے پر نابکار، ناہنجار، کوتی مشرب تضحیک و تمسخر سے باز نہ رہ سکے اور یہاں تک کہہ دیا کہ "یکے از صلحا را باد مخالف در شکم پیچید"۔ استغفر اللہ استغفر اللہ! مگر یہاں تو باد موافق ہی باد موافق ہے۔ مشاعروں میں اس زور و شور سے دادِ سخن جیسے اردو یہاں کی اپنی زبان ہو اور اس سے بھی اتنا ہی شغف جتنا بنگلا سے۔ کیوں نہ ہو دونوں آریائی نژاد، آریائی نژاد۔ اسلامی اثر سے پراکرت کی ترمیم شدہ صورت ہیں۔ جیسے توام بہنیں۔ کلکتہ میں تو وہی سنسکرت کی بھائیں

بن تھی۔ شکریہ قاضی نذرالاسلام، بنگال کے ہر دلعزیز شاعر نے
ا رنگ ڈھنگ بدلا اور زبان کو عربی فارسی کی جوئے شیر سے
راب و شاداب کیا بلکہ پُر بہار و گل و گلزار کیا۔ اور سننے والے
رگئے کہ اردو اور بنگلا ایک ہی غزل کا مطلع و حسنِ مطلع ہیں۔
، دوسرے سے اسقدر قریب اور ان کے بولنے والے بھی۔
باختری کیا خاوری۔ بوڑھی گنگا اور جہران ایک ہی مضمون میں گیا۔

اونہوں! پھر توسن طبع وہی غزل کی روش پہ چل نکلا
، شاعروں کا تذکرہ کرنے لگا۔ حالانکہ پہلے ڈھاکہ کی دلکشا
، وہوا کا تذکرہ لازم تھا۔ وہی بات:

بنگالہ شگرف آب و ہوائے دارد

—— بلکہ اس کے لمبے چوڑے سبزہ زارہائے مطر"ا اور
لی۔ اونڈٹام۔ جان واکر، شمپین جن، بئیر، شیری وغیرہ کی
پانی کو ملحوظ رکھا جائے تو اس کی صحیح کیفیت یوں ہوگی کہ

زہے ہوا ہائے سرد و خوشاب ہائے گوارا

فرخا بادہ ہائے ناب و خمر"ا ثمرہائے شیریں

شکلتہ بیں نہ ریل تھی نہ تار برقی نہ بجلی کی روشنی۔ نہ کالج،
نی ورسٹی۔ شہر کے باہر ہر طرف شاداب و سرسبز علاقہ تا حدِ نظر
ح نباتی کے کرشمے زمردیں تختوں کی صورت میں آشکار۔ خاقانی
ایسے ہی قطعاتِ خلد آثار کے بارے میں کہا ہوگا:

بنفشہ رستہ از زمیں بہ طرف جوئبار ہا

دیا گستہ حورعیں ز زلفِ خویش تار ہا

یہ تو ہوئی تشبیب بہاریہ بارے اب انبہ زار ڈھاکہ
بیاں ہو جائے۔ "ڈھکنی سے اک شہر ڈھکا، ڈھاکہ اس کا نام"
لیر نگر کی تو جو آن بان شان تھی سو تھی، مگر بخدا! انگریزوں کے
عت اور دیارِ پاک کے طلوع ہونے پر جو اس نے آب و رنگ
کیا ہے۔ جو چار چاند اس کو لگائے گئے ہیں سبحان اللہ!
ان اللہ! شہر کیا سے کیا ہو گیا۔ سنتے ہیں جو وسعت و کشادگی
ستان باختری کے عروس البلاد، کراچی میں پیدا ہوئی۔ پاکستان
دی کا قرۃ العین، ڈھاکہ اس کا برجستہ عکس ہے۔ شہر ہی نہیں
رکبھی گل سے گلستاں اور گلبرگ سے خیاباں ہو گیا۔ تعالی اللہ!
رنگی کشادگی اور بے شمار و گوناگوں عظیم الجثہ جہاز۔ کبھی چراغ دیر

میں بنارس کی تعریف و توصیف میں کیسے والہانہ زمزمہ پرواز ہوا تھا:

تعالی اللہ! بنارس چشمِ بد دور

بہشتِ خرم و فردوسِ معمور

مگر اب ڈھاکہ کو دیکھ کر تو وہ بنارس بہشتِ غیر خرم
و غیر معمور بن گیا۔ چلو، اس کے نام قصیدۂ غرّا بہ شکل مثنوی
منسوخ اور اس کا نمبر حسب شیوۂ فقیر ڈھاکہ بہشت آثار کے
نام پر۔ جیسے قبل ازیں طبع حقیقت پسند شیوۂ آئین فرنگ دیکھ کر
بصد شوق ان کی طرف مائل ہو گئی تھی۔ ویسے ہی اب فرنگی و ہندی
سے مفتاح السماع، حضرت امیر خسروؒ کے الفاظ میں "من قبلہ راست
کردم" کی مصداق ہوئی۔ بے شک:

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا

ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

ڈھاکہ کے دلکش بازار دیکھئے۔ وہ جو اہلِ فرنگ کے
بارے میں بتقریظِ "آئینِ اکبری" مصححہ سرسید کہا تھا، سب گلدستۂ
طاق نسیاں بن گیا۔

اب تو پہیے سے ہزار چند ایجادات طلسم آثار بروئے کار آ گئیں
اور موٹریں، بسیں کوچہ و بازار میں صبا رفتار ہو گئیں جن سے شملہ بازار
بھی مات ہو گیا۔

بندگان مکرمت شعار نے کہا چلو سیر کر آئیں۔ کہاں چپیں، پالکی،
تام جھام، ہوادار لاؤ۔ کہنے لگے مرزا صاحب! یہاں اب یہ پارینہ لوازمات
کہاں؟ یہ تو دنیائے آب بلکہ سرزمین آب رواں ہے۔ دلی، رامپور
تو نہیں کہ ہر طرف خشکی ہی خشکی ہو اور انسان کو "چارپائے" اٹھائے
پھریں یعنی کہار اور گھر گھر پکار ہو:

ذرا گھر کو رنگیں کے تحقیق کر لو

یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو؟

یہاں تو رہوار بے پایہ ہے یعنی "نوکا" سفینہ، کشتی، ڈونگا،
دخانی جہاز اور کشتیاں بھی کیسی رنگا رنگ۔ طاؤسی کشتی کو دیکھو تو
جیسے کھل سم سم سے رقص اور رنگ کا طلسم وا ہو جائے۔ گھر سے گھر
پیدل خرام کہاں۔ یہاں تو گھاٹ گھاٹ گردش مقام ہے۔ منڈی پینٹھ
بھی ہے تو کشتیوں میں۔ بعض خدا کے بندے جل ککڑی کی مثل ساری
عمر پانی میں ہی بسر کرتے ہیں۔ گھر بار، ہاٹ بازار سب کچھ کشتی میں ہی باکی

یا بن بنجارے گئے انہیں خشکی کہاں، وہ تو بس ناپید ہی ہے۔ ہر کہیں آب، ہوا، یا آگ۔ برائے خدا! آگ پر نہ چونکیے۔ کسان لوگ مارچ کے مہینے میں۔ آپ اسے بیمن و دے کہہ لیجئے۔ سب جنگل جلا جلا کر خاک کر دیتے ہیں۔ پھر ہوا چاروں طرف کھیتوں میں راکھ ہی راکھ بکھیر دیتی ہے۔ ایسی خاکستری زمین میں بیج بوئے جاتے ہیں۔ اس عمل کو "جھوم" کہتے ہیں۔ اس سے جو سبزی، ترکاری، ہریاول ہوتی ہے اس کے کیا کہنے۔ ندی ندی گھاٹ گھاٹ بڑے بڑے کدو ہی کدو دیکھئے جیسے اوندھائے ہوئے سفید سفید چلنے چلنے گھڑے ہی گھڑے قطار اندر قطار کیا بہار دیتے ہیں وہ۔ اب میں سمجھا نیر لاہوری کا وہ بیان کہ:

ہمیں خاک است کانجا ناپدید است

اور یہ کہ:

ازاں ایں ملک آشوب آفرین است

کہ بادِ او چناں آتش چنین است

ڈھاکہ کی سڑکیں دیکھئے ــــ سایہ دار، کشادہ، مصفا، پختہ، شستہ و رفتہ، ان پر ٹن ٹن کرتی رکشاؤں کی ریل پیل اور طنطنہ۔ ذہن نے رہِ وادیٔ خیال اختیار کرتے ہوئے پھر کلکتہ کی طرف بازگشت کی۔ وہ اس کی خشت و سنگ، چونے پلستر کی نفیس، قابل دید، قابل رشک عمارات۔ گورنمنٹ ہاؤس، ٹاؤن ہال، سینٹ جان کا گرجا، پرانا مشن گرجا مگر ڈھاکہ کی عمارات تو اور بھی غضب ڈھاتی ہیں۔ اب کیا بتائیں کیسی کیسی شاندار عمارات دیکھیں۔ جی خوش ہو گیا۔ وہ کرزن ہال۔ وہ احسن منزل۔ وہ ہائی کورٹ۔ کیا فن تعمیر ہے۔ کہیں شرقی کہیں فرنگی، کہیں بودھی اثر۔ غرضیکہ طلسمات ہی طلسمات۔

دو کالوں پر رنگارنگ نقاشی کی بہار۔ کیا کیا صناعیاں ہیں۔ یہاں کے بادوتوں نے مقامی چیزوں سے کیا کیا لطافتیں۔ نفاستیں، مینا کاریاں، طراحیاں پیدا کی ہیں۔ وہ شیتل پاٹی، وہ بانس اور ناریل کے سجیلے طرحدار نمونہ ہائے فن۔ طبیعت عش عش کرنے لگی۔ روح اہتزاز سے غش کرنے لگی۔ وہ رنگارنگ آنچل ہوا میں لہراتے۔ ڈھاکہ کی ململ اب بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اس کا تذکرہ کبھی سنا تھا۔ اب اس کو آنکھوں سے دیکھ لیا۔ مگر یہ باتیں پھر بھی معلوم عوام ہیں۔ اصل بات تو دیارِ پاک کی تعمیرات اور حاشیہ جات ہیں۔ مضافاتی نو آبادیوں کو حاشیہ جات نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے! ــ مجلس قانون ساز کا وہ مہتم بالشان ایوان۔ سبحان اللہ! نئی اسلامی مملکت کی سطوت کا آئینہ دار۔ اور ذیلی دار الحکومت کی تعمیر۔ آخران توسیعات و ترقیات کا کوئی کہاں تک ذکر کرے جیسے ساری سرزمین میں ندیوں نالوں دریاؤں جھیلوں تالابوں کا جال ہی جال بچھا ہے۔ ایک لامتناہی تانا بانا۔ ویسے ہی نئی نئی ترقیوں اور توسیعوں کی لین ڈوری بھی ہے جس کا سہرا نئی حکومت اور سب سے بڑھ کر انقلابی حکومت کے سر بندھتا ہے۔

رمنا سے طبیعت پھر ہرے بھرے مرغزاروں کی طرف بہنے لگی۔ کیا قطعۂ زمرد ہے کہ تاحد نظر بچھا ہے۔ جیسے کسی عظیم الشان طاؤس نے رقص کرتے کرتے زمین پر اپنے پر پھیلا دیئے ہوں۔ اور ندیاں نالے کیسے چمکتے ہیں۔ جیسے روپہلی تار۔ ادھر سنہری ریشے کی زرتار جھلک۔ گھر گھر زلف بنگال کا جادو لئے گھاٹ کا گھاٹ یعنی تال تلیّے ماور سانولی سلونی ناریاں گاگریں کلسیاں لئے پانی بھرتیں۔ ساڑھی کا دامن بھیگتا ہے تو بھیگے۔ ان کی بلا سے ان کی تو کائنات اور مایہ و خمیر یہی پانی کا ہے۔ یہ فقیر شاعر کی بجائے مصور یا عکاس ہوتا تو دوران قیام میں ان ہی کے عکس لئے جاتا اور تصویروں پر تصویریں تیار کر کے مستقر وام کو لے جاتا:

دریغ آں دم زاں ہمہ بوستاں

تہی دست رفتن سوئے دوستاں

یہاں تو قدم قدم پر ایسے تال ہیں جو کلکتہ کے تالاب گردن کو عرق شرم میں غرق کر دیں۔

اللہ اللہ وہ ندی نالوں میں مانجھیوں، مچھیروں کے میٹھے رسیلے سہانے گیت ـــ مرشدی، معرفتی، باؤل، ساری گان۔ بنگال کا فن مشہور جادو اور اس کی روایت انہی کے دم سے آج تک زندہ ہے۔

ـــ اور وہ کیلے کے جھاڑ، وہ تاڑ کے اونچے اونچے درخت جیسے خالق حقیقی نے حریری زمین کو ریشمی گل بوٹوں سے آراستہ پیراستہ کر دیا ہو۔ ماچھی بھات کا وہ لطف جیسے چاندی میں چاندی ملا دی۔

ـــ پاک میزبانوں نے کہا حضرت! اپنے اس شعر پر عمل کیجئے:

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالبؔ

چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

بڑے ڈھاکہ یعنی پاکستان خاوری کی بھی سیر ہو جائے۔ پوچھا کالسکۂ بخار یعنی ریل میں سفر ہوگا۔ بولے نہیں۔ ایک طیلسان نئی وضع کا ہے اور جس کے پروبالِ تند و تیز بال پریزداریا بادزن ہیں اور اوپر ہی اوپر حرکت کرتے ہیں، چشم زدن میں زمین سے اٹھا کر آسمان اور آسمان سے پھر عموداً زمین پر لے آئیں گے۔

صدر پاکستان نے حال ہی میں اس طرفہ بادپیما کو ان اطراف میں رائج کر کے آمد و رفت میں بے اندازہ سہولت پیدا کر دی ہے اور یہاں کے متوطنوں کو ایک نعمتِ عظمیٰ عطا کی ہے۔ طبیعت اس ایجادِ عجیب نہاد کا ماجرا سن کر ازبس شاداں و فرحاں ہوئی۔ اس بادپا پر سوار ہوئے تو ہری بھری زمین بساطِ مخملیں بن کر بہار نظارہ ہو گئی۔ اب کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا۔ وہ چاٹ گام وہ چٹگوڈا۔ وہ بے اندازہ طویل سمندری ساحل کہ اس پر آسودۂ دوام ہونے کو جی چاہے۔ وہ جابجا کارخانے ہی کارخانے مختلف قسم کے قماش کی بافت کرتے۔ رنگارنگ ماچیس بناتے۔ چندر گونا سے گزر ہوا تو ایک نظر کرنافلی پر پڑی۔ واقعی "کرن پھول" ہے یہ۔ مثل تارسیم اور جو مشین مسلسل کاغذ سفید تیار کرتی ہے ایک چادرِ سیمیں ہے کہ ان عظیم الشان کارخانوں کے بیستوں سے جدید فرہادوں نے موجنماں کی ہے۔ دیکھتے ہی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتی ہوئی روشنی کی سجل چادر سی لہرا گئی۔ اور صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا منظر یاد آ گیا۔ سبحان اللہ! کاغذی پیرہن شاید اسی قرطاس نامی قماش کا نام ہے۔ سنہری ریشے کی بافتہ مصنوعات اور ساڑھیوں کا زرباف۔ دونوں زر ہی زر۔ کرنافلی کی وہ برقابی رو۔ یہ بھی تو تابانی سطور ہے یا ایک جوئے شیر بلکہ جوئے طلبا شیر ہے۔ کارخانوں کا کوئی شمار بھی ہو۔ ان کو دیکھتے دیکھتے طبیعت سیر ہو گئی تو "ہیلی قپطار" کی ایک اور لاآہنگ سے سلہٹ پہنچ گئے۔ وہ سرزمین جسے باقی بنگال کی طرح اولیائے کرام ہی نے قلمرو روحانیان و کشورِ ایمانیاں میں شامل کیا تھا۔ اس کے وہ میل ہا میل تک پھیلے ہوئے چائے باغ جن کو دیکھتے ہی طبیعت میں زبردست ہلوٹ ولولہ ہلہلہ اور غلغلہ پیدا ہوا۔ ان باغات نے تو پیکن کو بھی مات کر دیا۔ بے اختیار اپنی وہ دل خوش کن تعریف یاد آ گئی:

جو با جیب نشینی و چائے پیمائی
بیاد آر حریفانِ بادپیما را

پرانی صحبتیں یاد آ گئیں اور دل میں ایسی از خود رفتگی پیدا ہوئی کہ کیا بیان کیجئے:

اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

تاکہ تنِ خاکی کے بندِ گراں سے رہائی دے۔ ذوقِ فنا کا نشہ بحدِ استغراق پہنچنے لگا۔ وجد و کیف نے عالم ارواح کے لئے پھر والہانہ کشش پیدا کر دی:

ایں چہ شورے است کہ در دورِ قمر می بینم
ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم

آشوب کلکتہ اور اقطاعِ ہند کے طوفان حوادث کے جاں فرسا سانح نے دل میں ایک شور پیدا کر دیا۔

اے طیارہ راں! طیلسانِ پولادی کو اوپر ہی اوپر سوئے عالم بالا لئے جا اور اس کے ساتھ طیارۂ روح کا رخ بھی سوئے بقعۂ جاودانی کئے جا۔ از عالم سفلی سوئے عالم علوی بازگرائی۔ مادے مجازی سے ملجائے حقیقی طرف ارخائے عناں فرما۔ اللہ بس۔ ماسوا ہوس:

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

"ایزدی سرہنگ" بقیہ صفحہ ۵۲

ہماری خوشی کا دن، ہماری عظمت اور سربلندی کا دن۔ اس لئے جب یہ دن منایا جاتا ہے اور شاہراہوں پر ہمارے بری، فضائی، بحری جوان اور ان کا ساز و سامان ہمارے سامنے سے گذرتا ہے، ہمارے طیارے فضاؤں میں بلند ہوتے ہیں تو ہر پاکستانی کی رگ و پے میں زندگی و مسرت کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ خدا کرے ہماری مسلح افواج اور بھی مضبوط و منظم، اور بھی ساز و یراق سے آراستہ ہوں تاکہ ہمارے اس بازوئے شمشیر زن کی بدولت پاکستان تعمیر و ترقی کے بام بلند تک رسا ہو۔

"رامش و رنگ"

(بلتستان: ایک جھلک)

عطا حسین کلیم

بلتی زبان کے بہت سے عوامی گیت اب تاریخی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں سے ایک "ردُورل چقبہ" بھی ہے۔ جو خپلو کے حکمران یبگو حاتم، خانِ اعظم کی فتوحات کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ یہ گیت تقریباً سترہویں صدی کے واقعات کی تاریخ کہا جا سکتا ہے، مگر اس قدر طویل مدت گذر جانے کے بعد بھی لوگ اس گیت میں چھپے ہوئے طنز اور سکاردو والوں کی شکست کے واقعات کو نہیں بھول سکے۔ غرض بلتی عوامی گیتوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور وابستہ ہے اور اس واقعے کی یاد دلا کر لوگ ایک دوسرے کو مخاطب کرتے اور قدیم ثقافتی کڑیوں کو باہم پیوست رکھنے کی سعی کرتے ہیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے بلتستان کی مغل دربار سے وابستگی اور بعد میں ایرانی مبلغین کی آمد سے یہاں فارسی کا رواج عام ہوا اور تہذیب و تمدن پر بھی ایرانی اثر بڑھتا گیا۔ شعر میں سادگی رنگینی سے بدل گئی اور حقیقت پسندی نے تصنع و تکلف کی جگہ لے لی۔ مذہبی رجحانات نے نعت، مراثی اور قصائد کو فروغ دیا۔ اور اس طرح بلتی زبان فارسی اور عربی سے نزدیک تر آگئی۔ مگر اس کے باوجود بلتی لوک گیتوں کی زبان ٹھیٹھ بلتی ہی رہی۔ چنانچہ ان گیتوں کا کوئی لفظ ابھی تک متروک نہیں ہوا ہے بلتستان کے ہر علاقے میں اب بھی لوک گیتوں کے قدردان مل جاتے ہیں۔ اور ان ہی سن رسیدہ بزرگوں کی بدولت ان گیتوں کا وجود باقی ہے۔ چند لوک گیتوں کے نام یہ ہیں:۔

سُوتی - کھری زوم - شینگ شیرپا - بیہ نانقپو - لینگ سپہ شچو - بوزو مریم - آتی همبالبس - خموبے کلون - چھوغو - خمول بے - ہرجی نو - ردورل چقبہ - شاہ بہرام چو۔

بلتی راگ جنہیں "حریب" کہتے ہیں، تعداد میں تقریباً ساٹھ ہیں۔ یہ بلتی راگ یا حریب بھی ایرانی موسیقی سے متاثر ہوئے۔ ہر ایک حریب کے متعدد حصّے کئے جاتے ہیں۔ ابتدائی حصّے کو جسے تمہید کہنا بجا ہوگا "رق" کہتے ہیں۔ یہ تمہید بھی ہر ایک حریب کے لئے مختلف ہوتی ہے۔ ان راگوں پر عبور رکھنے والے رق سنتے ہی اندازہ لگا لیتے ہیں کہ بقیہ حریب کیا ہوگا۔

جب بلتی ادب و ثقافت، موسیقی اور شعر و شاعری عروج پر تھے تو بلتستان کے ہر حصے میں ان راگوں کو سمجھنے والے بھی بکثرت موجود تھے۔ مگر اس وقت تمام بلتستان پر بھی جدت پسندی کا سایہ پڑ رہا ہے۔ لباس، خوراک، آداب و اطوار، شعر و شاعری، موسیقی غرض ہر چیز میں بلتستانیوں نے نئے طور طریق اپنانے شروع کر دیے ہیں۔ مگر پھر بھی پرانی ثقافت سے لگاؤ باقی ہے اور اس وقت ہم اس کا جائزہ یہاں پیش کر رہے ہیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا حریب کے مختلف حصّوں کے نام ہیں: رق، رگوہ، روانی، گوشہ۔ یہ بلتی حریب سینہ بہ سینہ چلے آ رہے ہیں۔ یہ چیزیں ضبطِ تحریر میں آج تک نہیں آئیں اور نہ یہ ممکن ہی ہے۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ موسیقی، شعر و شاعری، آداب نشست و برخاست، بلتستان کے مخصوص کھیلوں اور قومی تہواروں کے لحاظ سے "خپلو" کا علاقہ پورے بلتستان میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ کسی زمانے میں ان ساری چیزوں میں سکاردو کو مرکزیت حاصل تھی۔ مگر اب سکاردو مختلف لوگوں کی رہائش اور مقامی حکمران خاندان کے زوال کے باعث انقلاب کے دور سے گذر رہا ہے۔ اس لئے قدیم بلتی تہذیب و تمدن، قومی روایات اور وضعداری کے لحاظ سے بلتستان میں اب خپلو کا علاقہ ہی ایک نمونہ سمجھا جاتا ہے۔

اس وقت بلتستان میں ان تمام راگوں کو سمجھنے اور شہنائی پر ان کو بجانے والے تقریباً ناپید ہیں۔ صرف خپلو، پرکوتہ اور شگر میں بیس تیس راگوں کے جاننے والے استاد مل جاتے ہیں۔ ان میں خپلو کا استاد شکور علی، خاص طور پر مشہور تھا۔ مگر حال ہی میں اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب تو لوگ ان تمام راگوں کے ناموں سے بھی واقف نہیں۔ اس لئے بڑا ضروری ہے کہ ان کو محفوظ کر دیا جائے۔

عشاق - دبراب - حسینی - چھوغو ذکری - ژھون ژے ذکری -

یگ - دوگ - سنگیہ - چہارگ - پنجگہ - مغلوب - مخالف - دُوڑ مولا شکنہ سیگہ - بردہ ڈام - راست - عراق - آبادی - اِصفہانی - مجاز - بہاس - باسن - بھیروے - دیوگن حصار - نوروز صبا - نوری جنجوق - سندور ے - نوا - سارنگ - تلنگ - عشیران - نوروز عجم - نوروز عرب - پہلوی - للت - غزال - اداسی - سسری - کوہی - بہاکر - بیات - سورت - ذلب - نشا پورک - نہفتہ - حصار - صبا - زوان - سیندوری - کمانچہ - کوری - مرتعد لاچارے - نوبت وغیرہ ان راگوں میں "نوبت" بہت مشہور ہے - یہ حریب سال بھر میں صرف ۲۱ مارچ کو یعنی نوروز کی خوشی میں بجایا جاتا ہے - نوبت حریب کے بارہ گوشے ہیں - اس حریب کو مکمل طور پر پیش کرنے میں کم از کم پون گھنٹہ لگتا ہے - جس دن نوبت راگ بجایا جاتا ہے - اس دن نوبت بجانے والے سازندوں کو مقامی حکمراں کے ہاں سے ضیافت کے جملہ لوازم بھی عطا ہوتے ہیں - اس ضمن میں بلتی رقص کے سازوں کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا - خٹک ناچ کی طرح بلتی میں بھی متعدد رقص قدیم زمانے سے رائج چلے آتے ہیں - اور ان کے لئے خاص دھنیں مقرر ہیں، جنہیں "ہر ژے کار" یعنی ناچ کی دھنیں کہتے ہیں - رقص کی بعض مشہور دھنیں یہ ہیں :-

بُرزق چھوس - موِن چھوس - بُودھ چھوس - بلتی چھوس - کھچے چھوس - گشوپا - سنیوپا - چھوغو ترہ سوُل - مینڈوق بلتا نمو - تھین کار - فتونگ کار - ان مشہور دھنوں کے علاوہ غزلوں کی دھنوں پر ناچنے کا رواج بھی سارے بلتستان میں عام ہے - اس سلسلے میں بھی خپولو، شگر اور پرکوتہ وغیرہ میں قدیمی ناچ کے طریقے اب تک رائج چلے آتے ہیں - مگر بلتستان کا صدر مقام "سکاردو" اس اثنا سے بھی محروم ہوتا جارہا ہے البتہ غزلوں کی دھنوں پر ناچنے میں سکاردو والے بلتستان بھر میں سب سے زیادہ شہرت و مہارت رکھتے ہیں جس کا آجکل بڑا چرچا ہے۔

بلتی دھنوں میں "غبیر سا - غبیر چھوپ" نامی دھن منفرد دھن ہے - ایک طریقہ سے یہ دھن بلتی موسیقی کا تہوار کہلا سکتی ہے کیونکہ عام طور پر مشہور ہے کہ اس بلتی دھن سے بارش ضرور ہو جاتی ہے - بلتی موسیقی میں بیاہ شادی پر جو دھن بجائی جاتی ہے اُسے "چلاہو" کہتے ہیں جب حکمرانوں کے گھروں سے کوئی دلہن بن کر جانے لگتی ہے تو اس وقت یہ دھن بجائی جاتی ہے - اس دھن کے بجانے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ دلہن کو وداع کیا جائے اور مستقبل کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار ہو۔

بلتستان کے لوگ پھولوں اور موسیقی کے بے حد دلدادہ ہیں۔ اس لئے خوشی کی کوئی تقریب بھی ہو موسیقی کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی بلتی موسیقی کے مقبول سازوں کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے :- "ڈھول" بلتی طبلہ (جسے "ڈامن" کہتے ہیں) شہنائی، بانسری - (جس کی دو قسمیں ہیں۔ "چک چلینگ" اور "ژھان خلینگ") کرنائی اور چنگ - بلتی طبلہ یعنی "ڈامن" نقارہ کی شکل میں بنایا جاتا ہے مگر جسامت میں نقارہ سے قدرے کم ہوتا ہے - ڈامن کے دو حصے ہوتے ہیں - ایک حصہ "آبی" اور دوسرا "آتشی" کہلاتا ہے - طبلہ انگلیوں کی تھاپ سے بجتا ہے مگر اس بلتی طبلہ کو ایک ایک فٹ لمبی چھڑیوں سے بجاتے ہیں - اس خاص چھڑی کو بلتی میں "ڈان شی لنگ" کہتے ہیں - یہ سب ساز بلتستان ہی میں تیار ہوتے ہیں -

پولو بلتستان کا بہت مشہور اور قدیم قومی کھیل ہے - بلتستان کے ہر علاقے میں اسے لوگ بڑے شوق سے کھیلتے ہیں - اس کھیل کا سارا انتظام عموماً علاقے کا حکمران اور سردار کرتا ہے - کھیل سے ایک دن پہلے راجہ کے پیشہ ور سازندے جنہیں مقامی طور پر "موِن" کہتے ہیں علی الصبح حکمران کے محل کے سامنے شہنائی اور دوسرے سازوں پر مخصوص دھنیں بجاتے ہیں - پہلے کوئی راگ یعنی حریب بجایا جاتا ہے - پھر اُسی حریب کے مطابق کوئی لوک گیت چھیڑا جاتا ہے - لوک گیت کے بعد اسی گیت سے مطابقت رکھنے والی کسی غزل کی دھن بھی چھیڑتے ہیں - اس رسم کو "ژاتپ" کہتے ہیں - دوسرے دن پولو کھیلنے کے مقررہ وقت سے پہلے ہی سازندے پھر حاکم کے محل کے سامنے جمع ہو جاتے ہیں - پولو کے تمام کھلاڑی بھی گھوڑوں پر سوار چوگان برداروں اور ساتھیوں کو ساتھ لے کر مقامی حاکم کے ہاں پہنچ جاتے ہیں - کھیل کے مقررہ وقت تک یہ سازندے شہنائی پر حریب، لوک گیت، خاص دھن اور غزل وغیرہ بجاتے رہتے ہیں - جب کھیل کا وقت آتا ہے تو یہ سازندے "سَتَنْغ رَا" بجاتے ہیں - اس دھن کے بجانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اب پولو کے کھلاڑی کھیل کے لئے تیار ہو کر میدان میں اترنے ہی والے ہیں - "سَتَنْغ رَا" ایک مخصوص دھن کا نام ہے - پولو کھیلتے ہوئے گول کر لینے کے بعد کھلاڑی گیند کو لے کر پولو گراؤنڈ کے دائیں طرف سے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے میدان کے عین درمیان پہنچ کر "ڈانوق" یعنی ملّا (ضرب) مارتے ہیں - اُس وقت سازندے بڑے جوش خروش سے یہی دھن "سَتَنْغ رَا" بجاتے ہیں - اور شور و غوغا سے سارا میدان گونج اٹھتا ہے - پولو گراؤنڈ میں آتے اور جاتے وقت، جب کھلاڑی گھوڑوں پر سوار

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

"ایزدی سرہنگ"

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات ——— اور وہ بھی اس جوہری دور میں جب کشمکش حیات نے اس قدر شدید صورت اختیار کرلی ہے۔ بالخصوص دولت خداداد پاکستان کے تحفظ کا مسئلہ تو اور بھی شدید ہے۔ گرد و پیش کے حالات، برصغیر کے حریفوں کی نت نئی کرم فرمائیاں اور دور دراز کے رہنے والوں کی ریشہ دوانیاں جو غلط بخشیوں اور پشت پناہیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہیں، یہ ایک نوزائیدہ مملکت کے لئے کچھ کم دردِ سر نہیں۔ دریں حالات ہماری مسلح افواج ہماری سب سے بڑی پشت پناہ، ہمارا بازوئے قوی، ہماری مضبوط سپر نہیں تو اور کیا ہیں۔ ہماری ملی بقا کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ہر جارحانہ اقدام کے لئے تیار رہیں اور ہمیں اس پر فخر ہے کہ آج ہماری مسلح افواج کے تینوں بازو ——— بری، فضائی، بحری ——— سب اس قدر مضبوط، مستحکم، منظم اور ہر قسم کے سازوسامان سے لیس ہیں کہ ہم کسی بھی طرف سے جارحانہ اقدام کا منہ توڑ جواب دے سکتے ہیں۔ "یوم مسلح افواج" جو ہر سال منایا جاتا ہے، اس امر کی یاددہانی کرتا ہے کہ ہمارا بازوئے شمشیر زن موجود ہے۔ وہ مضبوط و توانا ہے۔ ہمارے ملی وجود کا محافظ اور ہماری بقا کا بہترین ضامن۔ اس لئے پاکستان کا ہر ہر فرد اس یوم کی تقریبات میں جذباتی و روحانی طور پر شریک و شادماں ہے۔

ہماری تاریخ بتاتی ہے کہ ہماری زندگی ہمیشہ مجاہدانہ رہی ہے۔ اور ہم نے ہمیشہ ہر قسم کے ناسازگار حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے۔ آج بھی ہم ایسے ہی حالات سے دوچار اور ان کے مقابلے کے لئے تیار ہیں۔ ہمارے سربراہ مملکت، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، نے مسلح افواج کے دن جو پیغام دیا، وہ حرف بحرف تمام قوم کے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے اور اہم حقائق کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے بجا فرمایا کہ ہم نے آزادی بہت بڑی قیمت دے کر حاصل کی ہے۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ ہماری قربانیاں کبھی رائیگاں نہیں جائیں گی۔ دنیا کی نجات بیشک امن ہی میں ہے مگر، اردگرد جنگ کے بھڑکتے یا بھڑکائے ہوئے شعلے ہمارے لئے ایک مستقل خطرہ ہیں۔ ان حالات میں خود امن عالم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ہوشیار رہیں، مستعد رہیں اور جارحیت کے ہر قدم کو روک دیں۔

یہ امر ہمارے لئے بے حد حوصلہ افزا ہے کہ اپنی سولہ برس کی مختصر مدت میں جہاں ہم نے اور میدانوں میں ترقی کے بڑے ہی تیز قدم دکھائے ہیں وہاں ہماری مسلح افواج نے بھی گریز پا ترقی کی ہے۔ بالخصوص دورِ انقلاب میں۔ آج ہماری مسلح افواج دنیا کی بہترین افواج میں شمار ہوتی ہیں۔ ظاہری حیثیت ہی سے نہیں بلکہ اپنی بے پناہ قوت حرب و ضرب میں بھی، جس کا وہ وقت پڑنے پر قبل ازیں بھی ثبوت دے چکی ہیں اور آئندہ بھی ایسا ہی کریں گی۔

ہماری مسلح افواج نے شروع ہی سے جو اہم کردار ادا کیا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ابھی پاکستان وجود میں بھی نہیں آیا تھا کہ ان کی خدمات جلیلہ کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اور پھر اس پُر آشوب دور میں جب کہ خود پاکستان اور صفحۂ ایام پر اس کی نئی نئی ابھری ہوئی ملت کا وجود ہی معرض خطر میں تھا، افواج نے اپنے پاکستانی بھائیوں، ان کے جان و مال کو بچانے کے سلسلے میں جو خدمات انجام دیں ان کا نقش ہمارے لوحِ دل سے کبھی نہیں مٹ سکتا۔ سب سے بڑھ کر دورِ انقلاب میں اس نے ملت کی بقا اور رفاہ و بہبود کی خاطر جو کچھ کیا وہ ہماری تاریخ کا ایک زرین باب ہے۔ انقلاب کے بعد بھی اس کے جذبۂ خدمت اور جوشِ دفاع کی وہی کیفیت ہے۔ اس کے حوصلے بلند ہیں اور وہ بڑی بڑی طاقتوں سے ٹکرا جانے کی بھی پروا نہیں کرتے جو تنہا یا دوسروں کی تائید سے اس کے خلاف نبرد آزما ہونے کو تیار ہیں۔

سب سے زیادہ حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ قیادت کی عنان ایک آزمودہ کار سپاہی کے ہاتھ میں ہے جو زمانے کے نشیب و فراز کو خوب سمجھتا ہے، جو خلوص، فہم و فراست اور حسن تدبر کا پیکر ہے۔ چنانچہ حال ہی میں اس نے جو دورہ کیا ہے اس نے پاکستان کو افریقہ و ایشیا کی اقوام میں مقبول ہی نہیں سربلند بھی کر دیا ہے۔ اور تعاون و اشتراک عمل کی کئی کئی صورتیں بھی پیدا ہو گئی ہیں جو عالمی پیمانہ پر انقلاب آفریں ثابت ہو سکتی ہیں۔ علاوہ بریں افریشیائی کانفرنس کی سربراہی نے پاکستان کے ساتھ اہلِ پاکستان کو بھی غیر معمولی مقبولیت و اہمیت عطا کر دی ہے۔

بلا شبہ ہماری مسلح افواج کا دن ہمارا اپنا دن ہے۔ ہمارا قومی دن۔

(باقی ص ۷۹ پر)

رپورتاژ:

”گنج ہائے نہاں“

”باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا“ ــــ غالب نے یہی کہا تھا۔ وہ ہمارے زمانے میں ہوتے تو ضرور کہتے: باور آیا ہمیں مٹی کا ہوا ہو جانا! مگر۔ وہ کیسے؟۔ یوں کہ بہ قول ان کے ہی:

در روزگار ما نتواند شمار یافت
خود روزگار ہر چہ دریں روزگار یافت

اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ــــ ”گنج ہائے نہاں آشکار یافت“۔ انہی میں سے ایک قدرتی گیس ہے۔ بلوچستان کے خشک، بے جان، لق ودق صحراؤں سے یہ چشمۂ فیض یکبارگی ابل پڑے ہیں ــــ ہم اسے چشمہ کہیں یا فوارہ یا کچھ اور ــــ

آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

اس کی بدولت اب ہمارے ملک کی مٹی سچ مچ سونا اگلنے لگی ہے، بلکہ سونے سے بھی زیادہ قیمتی اور کار آمد چیز جس سے آگ ہی نہیں بڑے بڑے نفیس پارچہ جات بھی بن سکتے ہیں۔

اس مٹی نے اپنے سینے میں ہزارہا سال سے جو خزانہ بلکہ دفینہ چھپا رکھا تھا اب سامنے آگیا ہے۔ سب روایتی خزانوں ــــ گنج قارون، گنج فریدوں، گنج شائیگاں ــــ سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر۔ یقین نہ آئے تو تھوڑی دور قدم رنجہ فرمایئے اور چلئے سوئی (بلوچستان) خود اپنی آنکھوں سے دیکھئے۔ مگر اتنی دور بھی کیوں؟ یہیں کراچی میں کیوں نہیں۔ بڑے بڑے کارخانوں، ملوں، ہوٹلوں بلکہ گھروں تک یہ خزانہ آپ ہی آپ رینگتے رینگتے کہاں کہاں نہیں پہنچ چکا ہے۔ جہاں بھی نظر اٹھا کر دیکھئے اس کا صاف، چمکدار، سنہرا روپ ــــ اس کا شعلۂ جوالہ ــــ بھڑکتا ہوا دکھائی دے گا۔ اور اس کی گھن گرج بھی دور دور سنائی دے گی۔

یہ سب کس کا کرشمہ ہے؟ ہماری قومی جدوجہد، محنت، سرمایہ، سائنس اور انجینیری نے مل جل کر وہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ جسے بس طلسمات ہی کہا جا سکتا ہے۔ وہ جن جو پہلے زمین کے مرتبان میں بند تھا اب اسے قابو میں لا کر فولادی ”بوتلوں“ میں بند کر دیا گیا ہے۔ سینکڑوں میل لمبی فولادی پائپ لائن جو سوئی سے چل کر ادھر کراچی تک اور ادھر ملتان، لائل پور تک پہنچ چکی ہے بلکہ اب تو یہ نئے دارالحکومت، اسلام آباد میں بھی پہنچنے ہی والی ہے۔ آج یہ دیو انسان کی گرفت میں ہے اور چوبیس گھنٹے بڑی مستعدی کے ساتھ کام کرتا ہے اور پھر کم خرچ بالا نشیں۔ جس نے سب چھوٹے موٹے دیوؤں ــــ دوسرے ایندھنوں، کو صفائی، تیزی، کم خرچی میں بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

قدرتی گیس نہ صرف مغربی پاکستان میں برآمد ہو چکی ہے بلکہ مشرقی پاکستان میں بھی نکل آئی ہے۔ سوئی (مغربی پاکستان) اور چھتک (مشرقی پاکستان) کے دو نام خاص طور پر اس سلسلے میں مشہور ہوئے ہیں۔ پہلے سوئی کی سیر ہو جائے۔ یہ جگہ کوئٹہ کے جنوب مشرق میں ۱۵۰ میل کے فاصلے پر ہے، اور سکھر سے ۶۵ میل دور جانب شمال۔ پہلے بہت کم لوگ اس چھوٹے سے مقام کو جانتے تھے اب تو اس ہی گیس کی وجہ سے سوئی کا نام بچہ بچہ کے علم میں آگیا ہے۔ پہلے یہاں آبادی بہت کم تھی مگر اب جنگل میں منگل کا مصداق ہے۔ پہلے یہ دشت وحشت تھا اب یہ گل گلزار بن چکا ہے۔ یہاں بلوچیوں کا بگٹی قبیلہ بسا ہوا تھا۔ گیس برآمد کرنے والی کمپنیوں کا اصول ہے کہ جہاں بھی گیس نکلے اسی کے نام پر گیس کا تجارتی نام رکھا جاتا ہے۔ یوں بھی قدرتی بات یہی تھی کہ گیس کا نام اس جگہ کی بنا پر ہی رکھا جائے۔

اس سلسلے میں ہمارے انجینیروں، کارکنوں، مزدوروں، مساحان ارض اور دوسرے جفاکش لوگوں نے جس ہمت و حوصلہ کا مظاہرہ کیا ہے پاکستان اس پر فخر کر سکتا ہے۔ گیس دریافت

کرنے پر روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ لوگ بتاتے ہیں کہ تیل سے بدبو تو یہاں اکثر جگہ کے پانی میں تھی اور اسی باعث تیل کی تلاش شروع ہوئی۔ مگر وہی بات ہوئی کہ آگ لینے جائیں اور پیمبری مل جائے! تیل تو نہ نکلا مگر اس کی دوسری شکل، گیس، نکل آئی۔ اس گیس کا سراغ ۱۹۵۲ء میں ملا تھا۔ اور اب صنعتی، زرعی، اور گھریلو ضرورتوں کے لئے اس سے ہر قسم کا کام لیا جا رہا ہے۔

یوں مغربی پاکستان میں گیس کے چھ جگہ طبقے معلوم کئے جا چکے ہیں اور مشرقی پاکستان میں پانچ جگہ۔ آپ پوچھیں گے یہ قدرتی گیس ہے کیا چیز ہے؟ دراصل یہ پیٹرول کا ہی ایک روپ ہے۔ جو مائع کے بجائے دھواں بن گیا ہے۔ قدرت اپنے زمین دوز کارخانے ــــ چٹانوں ــــ میں برابر پیٹرول کا روپ بدلنے میں مصروف رہتی ہے۔ اس عمل سے ایک خاص درجۂ حرارت پیدا ہو جاتا ہے اور دباؤ بھی۔ بھاپ کو زمین کی تہ سے نکال کر آگ بنا لی جاتی ہے۔ گیس جو ہوئی اس لئے اسے خاص قسم کے فولادی پائپوں میں سے گذار کر دور دور لے جایا جا سکتا ہے۔ اس گیس کی مانگ اس قدر بڑھ چکی ہے کہ پڑوسی ملک بھی اس کے خریدنے پر آمادہ ہیں۔ بعض دفعہ یہ قدرتی گیس زمین کا سینہ پھاڑ کر خود بخود باہر نکل آتی ہے کبھی برمانے والی مشین لگا کر کنوئیں کھودے جاتے ہیں اور گیس کو زمین کے نیچے سے اوپر لایا جاتا ہے۔ اس میں جو فالتو چیزیں ہوں ان کو دور کر دیا جاتا ہے اور ایسی حالت میں لے آیا جاتا ہے کہ یہ ہر قسم کے کام آ سکے۔

پاکستان میں قدرتی گیس کی تلاش پچھلی صدی ہی میں شروع ہو چکی تھی۔ سوئی کے شمال میں جو پہاڑیاں ہیں ان سے کبھی کبھی تیل اور قدرتی گیس بھی نکلتی دیکھی گئی تھی۔ ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۲ء کے دوران میں یہاں کوئی تیرہ اتھلے کنوئیں کھودے بھی گئے تھے، جن سے تیل کے ۲۵،۰۰۰ پیپے دستیاب ہوئے۔ مگر تجارتی طور پر یہ سلسلہ کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ اور یہ دھندا ختم ہی ہو گیا۔ پھر ۲۱ء میں ایک پیٹرول کمپنی نے اپنے ماہرین یہاں بھیجے اور دریافت کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ ایک اور تحقیقی مہم ۲۷-۱۹۲۶ء میں اپنا کام کرتی رہی۔ نقشے بنے اور جانچ پڑتال بھی ہوتی رہی مگر خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ پچھلی جنگِ عظیم کے بعد ایک اور پروگرام پر عمل کیا گیا جس کے مطابق پورے مغربی پاکستان میں تیل اور پھر گیس کی تلاش شروع ہوئی۔ ابتدا میں کوئی حوصلہ افزا علامت نہ دکھائی دی، بے اندازہ روپیہ خرچ ہوا مگر کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ لیکن باہمت لوگوں نے اس کام کو پھر بھی جاری رکھا۔ ۱۸ کروڑ روپے کے سرمائے سے ایک کمپنی باقاعدہ طور پر قائم کی گئی اور اس نے ۴۴ کنوئیں کھودے جن کی مجموعی گہرائی ۱۹۴،۳۵۷ فٹ شمار کی جاتی ہے۔ سوئی کے مقام پر ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو پہلا کنواں کھودا گیا۔ رات دن کام جاری رہا اور آخر کار یہاں چار ہزار فٹ کی گہرائی پر گیس نکل آئی۔ دوسرا کنواں پہلے کنوئیں سے ۵ میل کے فاصلہ پر کھودا گیا۔ اس طرح گیس کی دریافت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ گیس کو صاف کیسے کیا جائے، اسے پائپوں کے ذریعے ضرورت کے مقامات تک کس طرح پہنچایا جائے اور اس کے کاروبار کی شکل کیا ہو۔ ان تمام کاموں کے لئے مشینیں، ماہرین، آلات وغیرہ باہر سے منگائے گئے۔ بڑی بڑی کلیں اور آرے جا بجا نصب کئے گئے۔ پھر فولادی پائپ خاص طور پر تیار کرائے گئے اور انہیں جوڑ جوڑ کر سوئی سے کراچی تک پہنچایا گیا ہے۔ صنعتی کارخانوں، ہوٹلوں، گھروں اور دیگر مقامات پر چھوٹے پائپوں اور نلکوں کے ذریعے یہ گیس سب جگہ پہنچ گئی۔ اس کے بعد دوسری سمتوں میں بھی اسے دوڑا دیا گیا۔ اس پائپ کا جوڑنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اس کام پر چار ہزار کارکن اور مزدور دن رات کام کرتے رہے پائپ لگانے میں دشت و صحرا، پہاڑ، ندی، نالے، آبادیاں، بستیاں، سڑکیں، کھیت، دریا، ریلوے لائنیں، پل، غرض سب ہی حائلات تھے جنہیں دُھن کے پکے کارکنوں نے سر کر لیا۔ ہزاروں فٹ لائنیں جوڑتے چلے گئے اور آخری جوڑ کراچی جیل کے عقب میں ۱۸۔ اپریل ۱۹۵۵ء کو لگایا گیا۔ اُدھر پائپ نصب کرنے کا کام جاری تھا۔ اور اِدھر گیس صاف کرنے کی مشینیں الگ نصب کی جا رہی تھیں۔ بڑی بڑی دیو ہیکل چمنیاں فضا میں بلند ہو رہی تھیں۔ راستے میں روہڑی، نواب شاہ، حیدرآباد اور کراچی میں گیس کی دیکھ بھال کے صدر اسٹیشن قائم کئے گئے۔ ان تمام جگہوں پر گیس کو قبضے میں رکھنے اس کے تاؤ اور دباؤ کو مناسب حالت میں رکھنے کا اہتمام ہے۔ سوئی میں گیس جمع کرنے

کے لئے جو ذخیرہ گھر بنا ہے وہ ایشیا کا سب سے بڑا گیس گھر مانا جاتا ہے۔ یہ ایک دن میں تقریباً ساڑھے سات کروڑ مکعب فٹ گیس تیار کر کے صارفین کو دے سکتا ہے اور اس مقدار کو بڑھایا بھی جا سکتا ہے۔ بڑی بڑی چمنیوں کے ذریعے گیس کے فالتو اجزاء جلا دیئے جاتے ہیں اور اسے صاف کر کے پھر ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ مغربی پاکستان میں قدرتی گیس کی مقدار بہت کافی ہے۔ اس کا استعمال دگنا بھی ہو جائے تو یہ سو سال سے اوپر کام دے گی۔ پاکستان کی قدرتی گیس کا ذخیرہ دنیا کا ساتواں بڑا ذخیرہ مانا گیا ہے۔

سوئی کے علاوہ سابق پنجاب کے علاقوں میں بھی قدرتی گیس کی موجودگی اب یقینی ہو چکی ہے مثلاً ڈھولیاں کے مقام پر کافی بڑی مقدار برآمد ہوئی ہے۔ مزارانی کی گیس بھی عمدہ مانی گئی ہے۔ اُچ اور خیر پور میں بھی قدرتی گیس کے ذخائر کا علم ہوا ہے۔ ان سب ذخائر کا شمار کیا جائے تو ہماری یہ قدرتی دولت کئی صدیوں تک ہمیں، ہمارے لڑکوں، پوتوں، پڑ پوتوں بلکہ سگڑ پوتوں تک کو کام دے گی۔

مغربی پاکستان کی طرح مشرقی پاکستان میں بھی گیس کی دریافت کا سلسلہ عرصے سے جاری ہے۔ پاکستان کے پاس پتھر کے کوئلے کی کمی تھی۔ مگر قدرت نے گیس دے کر اس کی تلافی کر دی ہے اور پن بجلی بنا کر ہم نے اپنی ایندھن کی ساری مشکلات پر قابو پا لیا ہے۔ مشرقی پاکستان میں بھی صنعتی، زرعی اور گھریلو ضرورتوں کے لئے ایندھن کی کمی تھی مگر ۱۹۵۵ء میں سلہٹ میں بھی گیس نکل آئی۔ یہ سوئی کے ذخیرہ کا آٹھواں حصہ ہے مگر خوبی میں یہ سوئی گیس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ یعنی کثافت بالکل نہیں ہے جس کی وجہ سے بہت کم خرچ پر اسے صارفین کے پاس پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس گیس سے کیمیاوی کھاد بھی بنائی جا رہی ہے۔ جو زراعت کے لئے بیش بہا نعمت ہے۔ اس کے لئے فینچو گنج میں عظیم الشان کارخانہ نصب ہوا ہے۔ سلہٹ کے علاوہ رشید پور، تتاس (نزد ڈھاکہ) میں بھی قدرتی گیس برآمد ہو چکی ہے۔ سب سے بڑا ذخیرہ چھتک کے مقام پر نکلا ہے (۱۹۶۰ء)۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا، مشرقی پاکستان کی معیشت اور صنعت و زراعت کو اس گیس سے لازوال فائدہ پہنچتا رہے گا۔

قدرتی گیس جس جس طرح استعمال کی جاتی ہے اس کی بھی کوئی حد نہیں اور ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس قدرتی نعمت سے ملک کے دونوں بازوؤں کی معیشت اور ترقیاتی منصوبوں کو کس قدر فائدہ پہنچے گا۔

"رامش و رنگ" ——— بقیہ صفحہ ۵۱

گذر رہے ہوں اس وقت سازندے "علم کار" یعنی "راستے کی دھن" بھی بجاتے ہیں ——— غرض پولو یا چوگان کا یہ مردانہ و سپاہیانہ کھیل بڑے جوش و طمطراق سے کھیلا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ بلتستان کی ہر تقریب میں موسیقی کو نمایاں جگہ حاصل ہوتی ہے اور شعر و نغمہ کی موجودگی کے باعث ہر محفل و تقریب میں جان سی پڑ جاتی ہے۔ کچھ عرصہ قبل جدید رجحانات کے باعث لوگ اپنی قدیم روایاتِ شعر و نغمہ سے پہلو تہی برتنے لگے تھے مگر دورِ حاضر میں علاقائی ثقافت کے ان ہمیشہ زندہ رہنے والے اجزا کو فراموش نہیں کیا گیا اور ان کی حفاظت پر زور دیا جا رہا ہے تاکہ مقامی ثقافت کی ان جھلکیوں کو جن کا ہماری دائمی اقدار سے تعلق ہے، فنا نہ ہونے دیا جائے۔ امید ہے مقامی اہلِ ذوق بلتی ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور بلتی رامش و رنگ کے دلدادہ اپنے ان انمول ثقافتی جواہر کی قدر کریں گے اور ان کے جدید و قدیم روپوں کی حفاظت کی طرف متوجہ ہوں گے۔

جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

"ذکر میرا..."

ماوشما

مولانا امتیاز علی خاں عرشی:

آپ کے متعدد مودت نامے ملے۔ میں کیا عرض کروں کہ کس حال میں ہوں۔ سست قلم ہمیشہ سے تھا۔ اب بیماری اور ضروری مشاغل نے اس بری خصلت کو تقویت بہم پہنچادی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دو صفحے بھی نہیں لکھ سکتا... ان حالات میں آپ صبر فرمائیں۔ خداوند کریم اجر عطا فرمائے گا۔

آمین! ثم آمین!

آپ اس سال بھی ہماری سجائی ہوئی بزمِ غالب میں شریک نہ ہوسکے، اس کا افسوس ہے، گو میں یہی سمجھتا رہا کہ "یہ سال اچھا ہے"، پر برہمن نے حساب میں پھر غلطی کی! اب اس "واقعہ سخت" پر تاب لاتے ہی بنے گی۔ (مدیر)

آل احمد سرور:

غالب نمبر کے لئے آپ کا خط ملا۔ آپ نے جس محبت سے لکھا ہے اس کی قدر کرتے ہوئے ایک چھوٹا سا مضمون ضرور بھیج دوں گا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ادھر ایسی مصروفیات ہیں کہ واقعی سر اٹھانے کی فرصت نہیں۔ اگر صرف دوستوں کی فرمائشوں کا حساب لگاؤں تو صرف انہیں کی تفصیل میں سارا وقت نکل جائے۔

اس قدر افزائی کا شکریہ ―― "جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں!" غالب نمبر کے لئے مضمون تو نہیں ملا مگر میں انتظار ساغر کھینچ رہا ہوں۔ شاید مارچ (آئندہ شمارہ) (اشاعت خاص) کے لئے بروقت موصول ہوجائے۔

"کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا"

(مدیر)

گو پائے سخن ضرور درمیان ہے! (ر-خ)

نادم سیتاپوری:

لیجئے مضمون مکمل ہوگیا ہے ―― "غالب کی ایک قدیم سوانح حیات"۔ باوجود کوشش کے کچھ طولانی ہوگیا ہے۔ مگر موضوع ہی ایسا تھا کہ اختصار ممکن نہ تھا۔ آپ نظرِ ثانی کر لیجئے گا۔ کیونکہ مضمون عجلت میں لکھا گیا ہے اور بقول مولانا شبلیؒ کافی زخمی ہوگیا ہے۔

آپ بھاگے تو بہت زور سے مگر "بس" نکل گئی! آپ فرمائیں گے "ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا" مگر ہم بھی مجبور رہے۔ کب تک لگن میں پاؤں ڈالے بیٹھے رہتے۔ اس لئے جو ہمسفر مل گئے انہی کے ساتھ چل پڑے۔ (مدیر)

رفعت جاوید:

رات مرزا غالب کو خواب میں دیکھا۔ فرماتے تھے ان دنوں سب لوگ مجھ پر کچھ نہ کچھ لکھ رہے ہیں تو کیوں نہیں لکھتا؟ زرہِ امتثالِ امر اسی وقت یہ چند شعر موزوں کرکے سنائے۔ گراں گوش تو تھے ہی، اب اور بھی بہرے بھنڈ ہوگئے ہیں یا پھر دونا التفات تھا کہ بار بار پڑھوا کر سنا۔

مسکراتے رہے۔ آپ کے قارئین کو ان شعروں سے محروم رکھنا نہیں چاہتا اس لئے پیش خدمت ہیں:

مگس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو حلوہ تو جینے کا مزا کیا!
سُن اے غارت گرِ دستورِ پردہ
یہ برقع چاک کرنے کی ادا کیا
گئے ہم اور ہوا کھائے اُس کی
بغیر اُن کے کلفٹن کا مزا کیا
کھڑے ہیں نقش بر دیوار کب سے
ہے دیکھا اشتہارِ دلربا کیا
بہ یادِ زلفِ پیچاں گھاس کھانا
تمہارے جاں نثاروں کی غذا کیا

نہ تھا پولیس کا کوئی سپاہی
دلِ[۲] اغوا شدہ کو ڈھونڈتا کیا
جو ایٹم بم ہے ان کے پاس ہتیار
نہیں ہے پاس اپنے دسپنا کیا!
خداوندا کہاں جائیں، کدھر جائیں؛
یہ ٹریفک بھی ہے اک دامِ بلا کیا
غزل اور وہ بھی نوشہ کی غزل پر
نہ آئے گا ہمیں اب بھی نشہ کیا!

[۱] ناطقہ سر بگریباں کہ انہیں کیا کہئے!
[۲] دل کو بھی تو یار لوگ "حقلِ دل" ہی کہتے ہیں!
(ادارہ)

نئی کتابیں

مغرب کے عظیم فلسفی، تالیف عبدالرؤف ملک — ان دانایانِ مغرب کے حالات وافکار جنہوں نے اقلیم فلسفہ کو مسخر کیا اور جن کے خیالات وآراء کو تاریخ فلسفہ میں سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ کتاب بیک وقت فلسفیوں کی سوانح بھی ہے اور تاریخ فلسفہ بھی یہ مغربی فلسفہ پر واحد کتاب ہے جس میں اندلس کے عظیم مسلم مفکر علامہ ابن رشد کے حالات اور ان کے فلسفہ کا دانایانِ مغرب کے دوش بدوش بالتفصیل جائزہ لیا گیا ہے۔ قیمت ۷٫۵۰ روپے

شخصیتیں: عبدالقدیر رشک۔ دُنیا بھر کی شخصیتوں سے ملاقات کا واحد ذریعہ اس کتاب کا مطالعہ ہے۔ اس میں سیاست، آرٹ، علم، ثقافت اور فن کے ہر اس فنکار کا تعارف ہے جس کے حالاتِ زندگی کا جاننا آپ کے لئے ضروری ہے۔ قیمت: ۳٫۵۰ روپے

اسلام اور اصول حکومت: مصری مصنف علامہ عبدالرزاق کی عربی تصنیف کا ترجمہ۔ اس کتاب میں اس نظریہ کو پیش کیا گیا ہے کہ خلافت ایک اسلامی ادارے کی حیثیت سے ختم کر دینی چاہئے۔ خلیفہ کو قرآن اور سنت سے کوئی سند حاصل نہیں چونکہ دونوں میں محض اصول احکام ہیں۔ خلافت کے دینی و دنیاوی ہونے کا نظریہ رسول اکرمؐ کے منصبِ رسالت کی غلط تاویلات پر مبنی ہے۔ آنحضرتؐ کی بعثت کا مقصد یہ نہ تھا کہ دنیا میں ایک نئی ریاست یا ایک نئی حکومت وجود میں آئے۔ رسول کریمؐ کی حاکمیت دینی تھی نہ کہ دنیاوی۔ ۴٫۰۰ روپے

سُر سنگیت: موسیقی محض نشاط روح کا سامان نہیں ہمارا ثقافتی اور تہذیبی سرمایہ بھی ہے۔ تالیف: کنور خالد محمود۔ عنایت الٰہی ملک۔ کلاسیکی موسیقی سے متعلق لٹریچر کی کمی ایک عرصہ سے محسوس ہو رہی تھی۔ اس کتاب میں جہاں موسیقی کی تکنیک اور روایات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے وہاں یہ کتاب موسیقی کا فن جاننے اور سیکھنے والوں کی بجا طور پر رہنمائی بھی کرتی ہے۔ (روشن آرا بیگم) قیمت: ۵/-

چتر لیکھا: ہندی کا شاہکار ناول "چتر لیکھا" اس نام کی ایک بازاری عورت کی داستان ہے جو گناہ کا مجسمہ بن کر ناول میں داخل ہوتی ہے۔ لیکن ناول کے ارتقا کے ساتھ ساتھ اس کا کردار بدلتا ہے۔ وہ ایک سنیاسی کمارگری کی تلقین سے متاثر ہو کر سنیاس لے لیتی ہے۔ اور اس کے آشرم میں پناہ لے لیتی ہے۔ لیکن کمارگری کی دبی کچلی ہوئی جنسی خواہشات بیدار ہو جاتی ہیں اور وہ اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ یہی ناول کا نقطۂ عروج ہے۔ عمدہ کتابت طباعت۔ جاذب نظر سرورق۔ قیمت -/۴

مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کی نشری تقریروں کا مجموعہ

کانوں سُنی

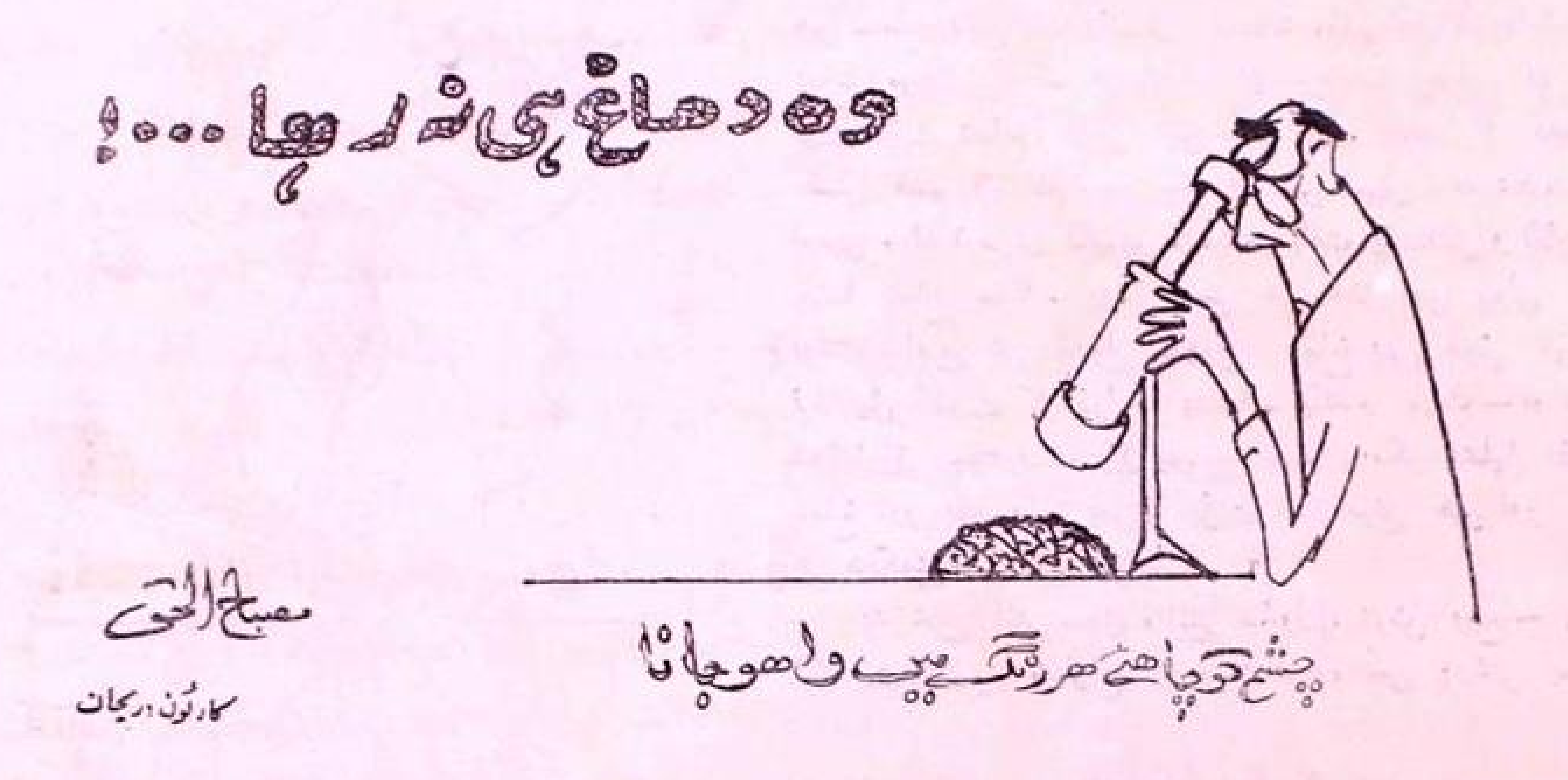
جس میں مولانا مرحوم کا مخصوص اندازِ بیان، مزاح اور رانشا ایک ایک جملے سے مترشح ہے۔ زیر طبع

نظم		پنجابی ادب		تاریخ و سوانح	
راہ و رسم۔ عبدالمجید سالک	۳-۵۰	ڈوہنگیاں شاماں (کہانیاں) نواز	۲-۵۰	اسلام اور اصول حکومت علی عبدالرزاق	۴-۰
ناول و ڈرامہ		بھائیاں (مضمون) شرف کنجاہی	۳-۲۵	انسان کا عروج: رضیہ سجاد ظہیر	۲-۵۰
سحر سے پہلے: رابعہ سعید	۳-۵۰	ساوے پتر (نظماں) موہن سنگھ	۲-۵۰	ہمارے کھیل (مقبول عام کھیلوں کے قواعد پر اردو میں پہلی کتاب)	۴-۵۰
لغزش، عبدالمجید بھٹی	۲-۵۰	پنجابی ادب تے سالک۔ سالک مرحوم دیاں پنجابی تحریراں	۱-۵۰		
کپتان کی بیٹی: خدیجہ عظیم	۲-۵۰	نویں رُت (چونویاں نظماں) امرتا پریتم	۳-۰۰	بیڈن پاول (سکاؤٹ تحریک کے رہنما کے حالات)	۲-۵۰
شیشے کی دیوار (مرزا ادیب)	۳-۲۵	ترنجن (نظماں) احمد راہی	۲-۰۰	گناہ اور سائنس ڈاکٹر ای سن کارڈ	۲-۵۰

پیپلز پبلشنگ ہاؤس

المینار مارکیٹ چوک انارکلی۔ لاہور

وہ دماغ ہی نہ رہا . . . !



چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

مصباح الحق

کارٹون: ریحان

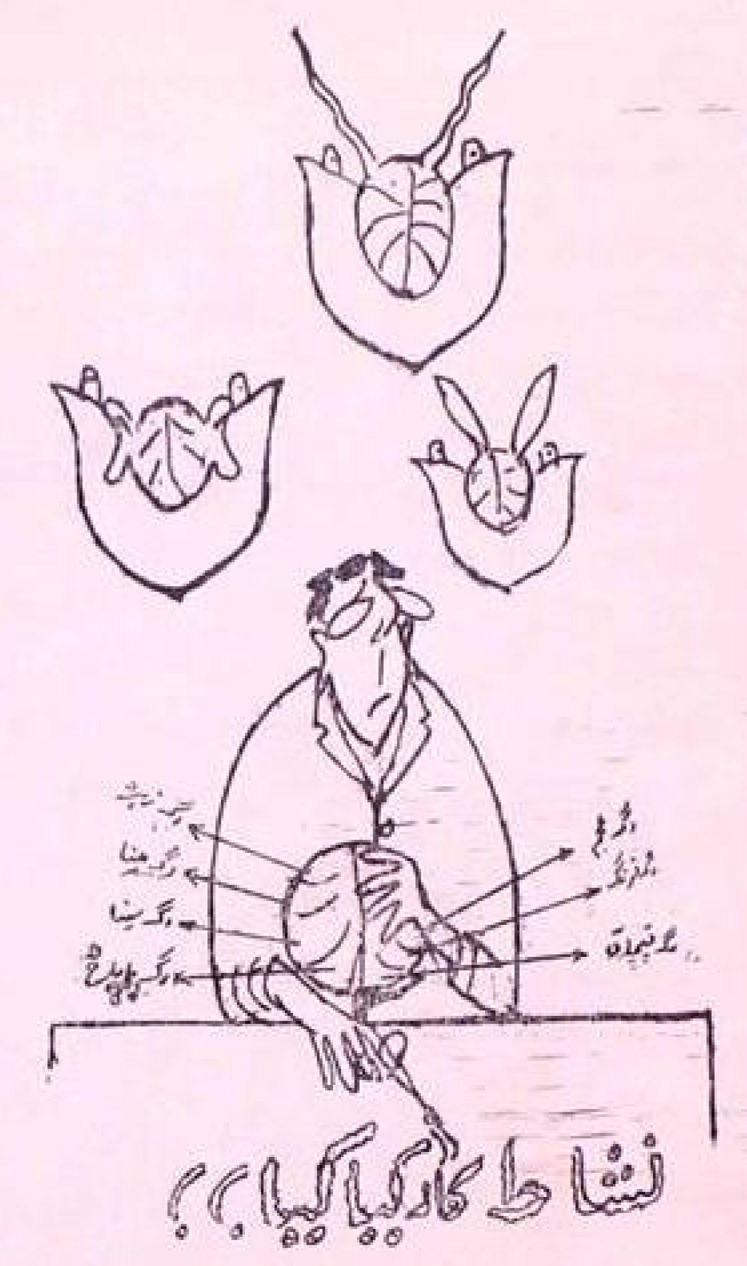
اس میں کچھ شائبۂ خوبی تقدیر بھی ہے۔ ایک کے بعد دوسرا۔ پہلے سر سید جیسا عالی دماغ، اور اس کے بعد مرزا غالب۔ دونوں آسمان عظمت کے رخشندہ آفتاب۔ این سعادت بزور بازو نیست۔ تانبخشد خدائے بخشندہ۔

سرسید کے سلسلے میں محرومی قسمت کی شکایت کس سے کیجئے کہ انہوں نے دو بار پیشکش کی۔ دو بار اپنے دماغ کی قیمت لگائی تاکہ وہ بعد از مرگ بھی اپنی قوم کے لئے مفید ثابت ہوں اور جو رقم ان کے دماغ کی فروخت کے طور پر موصول ہوئی اسے قومی چندہ میں دے دیا جائے۔ اس طرح موت میں بھی ان کا دماغ قوم ہی نہیں نوع انسانی کے لئے فائدہ مند ثابت ہو۔ دونوں بار مجھی کو ان کے تجزیۂ دماغ کے لئے منتخب کیا گیا۔ تیسری بار — مگر اس کا تذکرہ ہی کیا۔ نہ اس کی نوبت آئی، نہ میں . . .

مگر ”غالب“ — ”غالب“ نام آور — میری انتہائی خوش نصیبی ہے کہ مجھے ان کے دماغی تجزئے کی سعادت نصیب ہوئی اور میں اس کے بارے میں اپنی رپورٹ پیش کر رہا ہوں۔ فی الحال سر سری، مگر بعد میں مفصل۔

لطیف سی لطیف چیز — شاعر اور مرزا ”غالب“ جیسے عظیم شاعر کا دماغ — میں سوچتا ہوں اتنی لطیف چیز اور ایک سرجن کے کرخت ہاتھ! اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ بھی نرمی برت سکا کہ نازک سے نازک اور مہین سے مہین چمٹیاں برتوں جن سے ایک شاعر کے نازک دماغ کو کم سے کم خلش ہو۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ میں نے اس کی رگ رگ کا جائزہ لیا ہے۔ ان کو مس کیا ہے جس کا احساس میرے دل میں برابر موجود ہے۔ میں نے ان کی باریکیوں پر نظر ڈالی ہے اور اس کا کیف مجھ پر اب تک طاری ہے۔

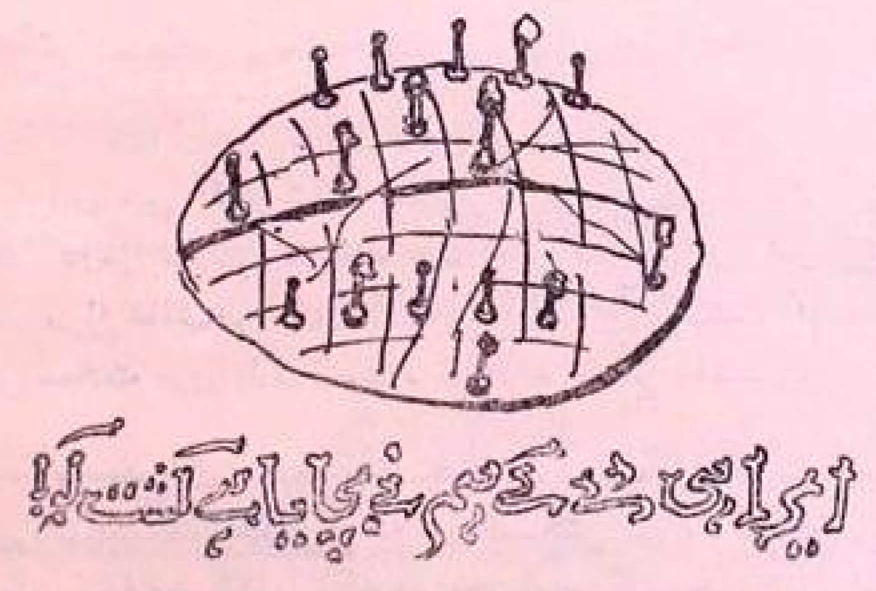
میرے سامنے چونے کے بھیگے پتھر یا کسی مرجھائے پتے کی اس سفید سفید جالی کا نقشہ ہے جس میں نہایت ہی باریک لکیروں اور چھوٹے چھوٹے ریشوں کا بڑی ہی



نشاط کار کیا کیا؟

عمدہ بنت کا چھوٹی سوئی جیسا تانا بانا دکھائی دیتا ہے۔ ان کو چھوتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ ڈھاکہ کی ململ سے بھی زیادہ ملائم اور لچکدار چیز کہیں خراب نہ ہو جائے — بھلا مکڑی کے جالے کے تار بھی اس سے زیادہ باریک اور چمکیلے چمکیلے کہاں ہوں گے۔ ایک اچھے دماغ کی علامت اس کے سوا اور کیا ہوگی؟ معمولی حیوان کیا اور ان کے دماغ کیا - یہی بکرے، خرگوش وغیرہ - کیا پدی کیا پدی کا شوربہ، ذرا سا گودا — بالکل ٹھس — اس میں ایسی مہین مہین نفیس نفیس نسیجوں کا جال کہاں — زیادہ سے زیادہ تین چار لکیریں، وہ بھی موٹی موٹی — جوں جوں انسان کی طرف بڑھیں دماغ زیادہ بہتر ہوتا جائے گا - اور رگوں ریشوں کی تو کوئی حد ہی نہیں - ان گنت، پیچ در پیچ — دماغ کے خانوں کی بناوٹ زیادہ پرکار — اور گوناگوں — اور پھر بڑے بڑے پیغمبر، شاعر، مصور، مغنی، "ان کا کہنا ہی کیا - جتنا دماغ ترقی کرتا جائے، اتنی ہی رگیں بھی زیادہ گہری ہوتی چلی جاتی ہیں — جیسے ریشم کے لچھے - یا ہلکی پھلکی لچکیلی ڈوریاں ہی ڈوریاں — جونہی انسان کوئی نیا تجربہ حاصل کرتا ہے، تو دماغ میں ایک نازک سی لکیر بڑھ جاتی ہے - اور جتنا اسے زیادہ استعمال کیا جائے اتنی ہی وہ گہری بھی ہوتی چلی جاتی ہے — اور یہ دماغ جو اس وقت میرے سامنے ہے، اس میں تو اکاس بیل کی طرح رگوں اور ریشوں کا ایک بے پناہ سلسلہ ہے۔ نکھرا لکھرا بڑی نفاست سے لٹھا ہوا — خدا جانے کس کس طرف باریک باریک ریشے ہی ریشے نکلتے چلے گئے ہیں - مگر پہلے بات وزن کی ہے - اتنا وزنی اور اتنا گٹھا ہوا دماغ میں نے کم ہی دیکھا ہے — ویسے ہونے کو تو بڑے بڑے دماغ ہوتے ہیں مگر نرے کدو کے کدو - کسی قسم کی اقلیدسی چیز ان میں نہیں - نہ خط، نہ قوسیں، نہ ترمری لکیریں، مشجر بافت یا نقش و نگار - جیسا دماغ موٹا، بھدا ویسے ہی عقل بھی موٹی اور بھدی - ایسے ہی چھوٹے چھوٹے دماغ بھی ہوتے ہیں، نرا چیل کوے کا ذرا سا بھیجا - ایکدم سپاٹ — "شاہ دولہا کے چوہوں" کے بھیجے جیسا - مگر اعلیٰ نفیس دماغ اور پھر وزنی بھی، بڑے نادر ہوتے ہیں اور کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں -

یہ "خانے اتنے سجل"، اتنے سڈول"، خوش وضع — یوں لگتا ہے جیسے شطرنج کی بہت عمدہ سی روغنی بساط



بچھی ہو - مرصع، پرکار اور خانوں میں ہیولائی قسم کے نہایت عمدہ ہاتھی دانت کے بڑے ہی نفیس نفیس مہرے اپنی اپنی جگہ لگے ہوئے - ایسے خوش نما شاہ، فرزیں، فیل، رخ، اور پیادے کہ بس دیکھتے ہی چلے جائیں، اور یہ جو بےشمار ٹیڑھی میڑھی لکیریں، کسی نگار دلربا کے دست حنا آلود کے سحر آفریں خطوط کی طرح - بڑی ہی استادانہ چالیں ہیں کہ ہر چال میں شہ مات ہی شہ مات ہو - اور جیسے شطرنج ویسے ہی شاعری - کیا کیا خطوط ہیں - کہیں ایک ٹیڑھی چال، کہیں دوسری کاواک مور چال (آخران کے آبا - جماعۂ اتراک - کا پیشہ سو پشت

سے سپہ گری ہی تو تھا ، گو یہاں رگ قیچاق بہت ہی دبی ہوئی اور رگ ایقورس بہت ابھری ہوئی ہے۔ اور رگ ،، پاپاخ ،، با طمطراق سے مل کر اور بھی ابھر جاتی ہے اور ذریعہ نمود بنی ہے ۔ رگ قاہ قاہ نے بھی کیا رنگ پیدا کیا ہے !) اور کہیں دوہری دوہری چالیں بھی - اہا ہا ہا ! یہ رگ ! جیسے بڑھتے بڑھتے پلٹ کر دوتا ہو گئی ہو - میں کہاں اور شاعری کہاں - مگر کسی نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ مرزا نوشہ نے کچھ تمثیلوں میں بھی ایسی ہی دوہری دوہری باتیں کہی ہیں اور کہیں پلٹ کر بڑی ہی استادانہ چالیں بھی چلی ہیں - کیا شعر سنائے تھے کسی نے ؟ ہاں یاد آیا :

غم آغوش بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغ روشن اپنا قلزم صرصر کا مرجاں ہے

ہوا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

اور یہ بھی کہ :

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

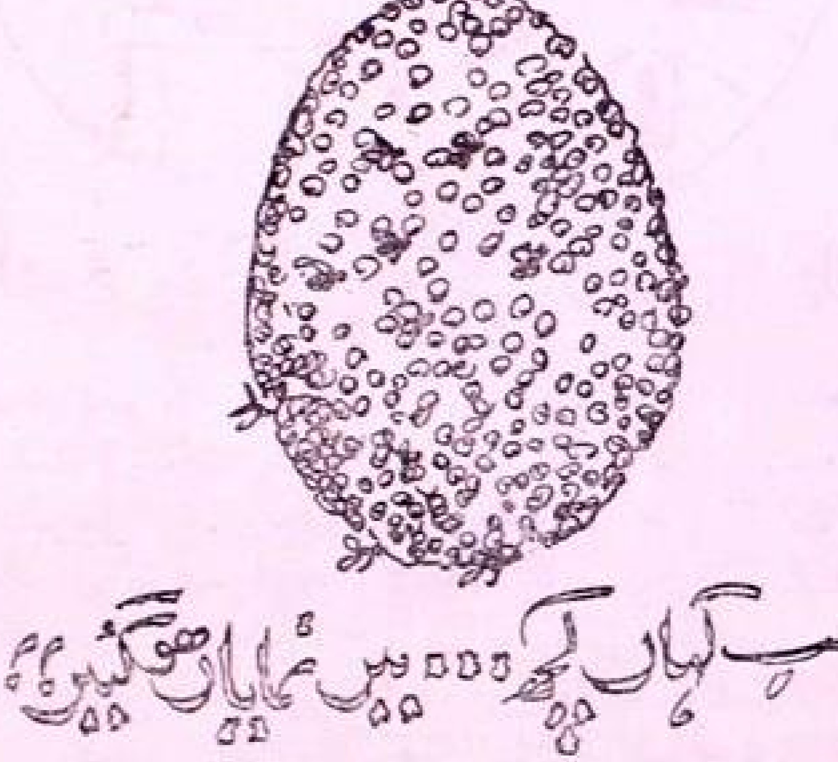
یہ خانہ — اس کی ابھری ابھری سطح ٹیلے یا اسٹوپ کی طرح اور پر مغزی بھی یہی بتاتی ہے کہ آدمی بڑا طبیعت دار ہے اور کائیاں بھی - طرح طرح کی تدبیروں سے پر - ہر کہیں کوئی اچھوتی حکمت عملی ، انوکھا کرشمہ — دماغ بھرا بھرا ہونے کے معنی ہیں طرح طرح کے گھیرے گھیرے اونچے اونچے خیال — بڑا بڑا گھیرا ڈالے - جیسے کوئی شاندار چھاؤنی - کسی سپہ سالار — لہراسپ ، ارجا سپ ، رستم ، اسفند یار کا ترکانہ بلکہ شاہانہ خواب — خیال بھی عبارت بھی ، بھری پری — بلیغ ہی بلیغ — تہہ در تہہ جیسے کسی تان کپتان کے الٹے سیدھے تان پلٹے !

صورت ما شدہ عکس تو در آئینۂ ما

واہ واہ واہ ! کلاہ پاپاخ کی طرح یہ اونچے اونچے دماغی کلس اور کلسیاں - قبے ہی قبے - لچھے ہی لچھے - ان سے ریشم کے ملائم ملائم تاروں کی طرح کیا کیا نفیس پیچ و خم اور پھندے ہی پھندے نہیں پیدا ہوتے ہوں گے - شعرو سخن کی زبان میں انہیں غالباً ''تراکیب'' ہی کہتے ہیں - سچ مچ کی ''ترکیبیں'' کیونکہ یہ حسن تدبیر ہی سے تو پیدا ہوتی ہیں اور ترکیبیں بھی پے در پے ترکیبیں - سلسلہ در سلسلہ :

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

یہ ''صد دل ربائی'' تو ست گنبد ، بلکہ صد گنبد عمارتوں کی شان جمالی بھی لئے ہوئے ہے اور شان جلالی بھی - وہی ترکانہ آن بان ، طمطراق ، جیسے میدان سخن نہ ہو میدان جنگ بلکہ میدان رستخیز ہو جس سے الفاظ ، تراکیب ، استعارات ، تمثیلات اور معانی کا محشرستان نمودار ہو - یہ دماغی ابھار نہیں ہیں دل ہی دل ہیں ! جیسے الف لیلہ کے قصے میں علی بابا کے دالان میں اونچے اونچے نفیس صراحی نما مرتبان ہی مرتبان - زیادہ طاقتور قسم کی محدب شیشوں والی خوردبین سے دیکھا جائے تو شہد کے چھتے کا سا دل آویز منظر دکھائی دیتا ہے جنہیں مرزا ' خان زنبور عسل ' کہہ کہہ کر خوش ہوتے تھے اور بے شمار چھوٹے چھوٹے خانوں میں شہد ہی شہد بھرا پڑا ہے - شاعر کی صحبت کا اثر دیکھئے سرجن کو بھی کیسی کیسی شاعرانہ باتیں سوجھنے لگیں -



جو کیفیت ہاتھ کی لکیروں کی ہے وہی دماغ کی لکیروں کی بھی ہے - دونوں سے انسان کی ذات پر روشنی پڑتی ہے - دماغ کی لکیروں سے کہیں زیادہ یہاں بھی طالع کے زائچے ، انہیں زیچ ایلخانی کہئے یا کچھ اور — ''دولت خانے'' ، حسن کے کاشانے ، رنگا رنگ پیمانے اور ہا و ہو سے پر میخانے ہیں اور برج مشتری ، برج زہرہ ، برج عطارد ، برج اسد سبھی کچھ ہے - ماہرین جراحی نے ان کے بڑے ہی دقیق نام رکھ چھوڑے ہیں - سہولت کے لئے آپ رگ زہرہ ، رگ مینا ، رگ سینا ، رگ شیراز ، رگ فرنگ ، رگ چنگ ، رگ رنگ سمجھ لیجئے - رگ زہرہ ، سبحان اللہ ! —

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

ایک بہت بڑا کرشمہ یہ کہ دماغ کے دونو پٹ کھلتے ہی چند در چند درازوں میں ایک طرف خطوط ہی خطوط اور دوسری طرف تصاویر ہی تصاویر دکھائی دیتی ہیں - کیا کیا خط اور کیا کیا تصویریں !—

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں !



بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

غرض تمام حشر آفرینیاں جو کرشمہ و ناز و ادا اور صاعقہ و شعلہ و سیماب سے وابستہ ہیں، یکقلم برق ریز - مگر ان پر بھی ایک پردہ چھایا ہوا —— شاید یہ صنف غزل کا پردہ ہے جو حسن شاہداں کا غماز نہیں، پردہ پوش ہے ، نہ حسن نمایاں نہ عشق - اور اگر آئینہ یعنی آئینۂ قدرت - کو دیکھا جائے تو اس پر بخارات ہی بخارات کا دبیز پردہ - اے عجب ! چمن زنگار ہو آئینۂ باد بہاری کا ؟ کتنا انوکھا انکشاف ہے - حسن کا نظر باز ، قدرت میں حسن کا تماشائی نہ ہو - کہیں اس میں شوخیٔ اندیشہ ، گوشۂ میخانہ یا خلوت کا شانہ کو تو دخل نہیں - اور ان سے بھی زیادہ دود چراغ کو ؟ شغل مے سے رگ بالیدہ بلکہ ماؤف ہو گئی ہے - یہ اسی کا نتیجہ یعنی خمیازہ ہے کہ دماغ کا آماس فرش سے عرش کی طرف پرواز کا غماز ہے بزم ہستی سے گریز، تجربہ —— فلسفہ ، خیال آرائی کی طرف اقدام - جراحی بھی کیا علم دریائی ہے — کہاں سے کہاں لے گیا — ایک سرجن کہاں اور نقد و نظر کہاں — مگر سرجن کا نشتر کبھی نقاد کی نگاہ سے زیادہ تیز بھی ہو جاتا ہے اور حقیقت کا آئینہ دار بھی -

عجیب تر یہ کہ خانہ ہائے دماغ تمام خلط ملط ، خانہ خانہ دیوان بے شیرازہ - مربوط ہوتے ہوئے بھی نا مربوط - کہیں یہ شغل مے کا کرشمہ تو نہیں ؟ یا پھر غزل کا کرشمہ ! تعجب ! ایک بنیادی بات - شاعر کے شاعر ہونے کی تردید —— ترقی معکوس - احساس سے بیان کی طرف نہیں، قافیہ سے مضمون کی طرف رجوع - کم از کم خانہ ہائے دماغ سے تو یہی نمایاں ہے - گو سنتے ہیں شاعر اور اس کے مداحوں کا دعویٰ کچھ اور ہے -

ادھر ، یہ خلیے - طرفہ تر ! دو پردے زیر و بالا —— ایک دوسرے میں سرایت کرتے ہوئے - ایک میں مادہ سراسر بیگانہ - اس قدر کہ سارے پردے ہی پر جنس غیر ہونے کا شبہ ہو - مغز ، نکتے ، لکیریں، شوشے، گوشے، پہلو، جس کے معنی ہیں خیال، مضامین - تشبیہیں، استعارے ، ترکیبیں سب کچھ بڑے ہی وسیع پیمانے پر مستعار—دوسرا پردہ اسقدر تنگ، تنگ حالانکہ سرسری نگاہ سے دیکھنے میں یہی نمایاں لگتا ہے اور سب یہی کہتے ہیں کہ سب کچھ یہی ہے - یعنی صاف لفظوں میں اپچ ہی اپچ ، اجتہاد ہی اجتہاد - یہ منظر، اس سے دل چونک کیوں نہ اٹھے - میری رپورٹ، میرے نتائج ، ان کو کون مانے گا ؟ ایک طرف ''غالب'' دوسری طرف ایک معمولی سرجن - دماغ اس تجزیہ سے پریشان ہوا جاتا ہے ، سراسیمہ ، سرسامی ، درھم برھم — آنکھ وا — ! تو کیا یہ سب دماغ ، ہی کی کرشمہ پردازی تھی ؟ میرے اپنے دماغ کی ؟ . . . خواب تھا جوکچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا ! ''غالب'' نے درست ہی کہا تھا :

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا !

[illegible]

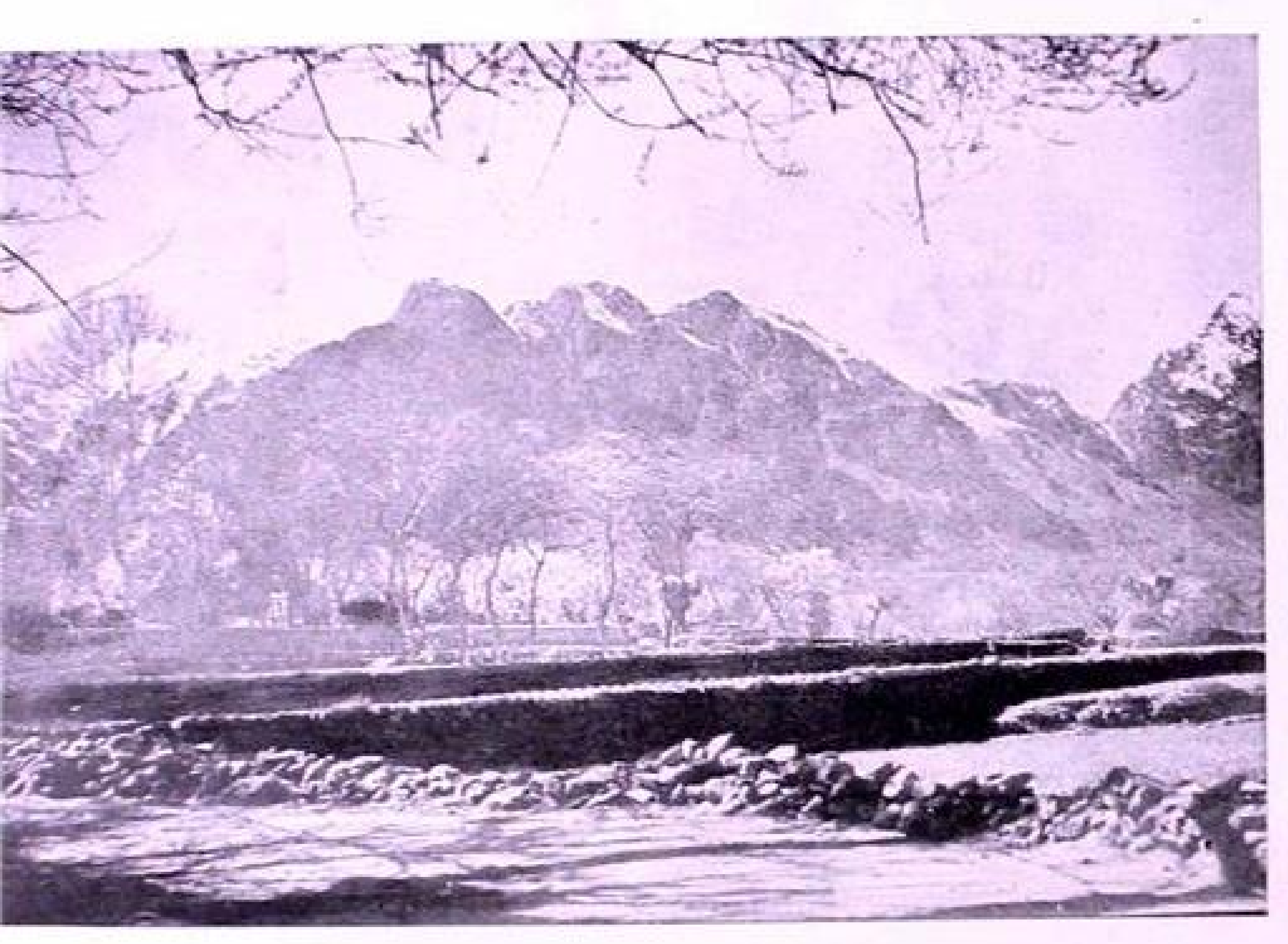


"نازش دودمان آب و ہوا"

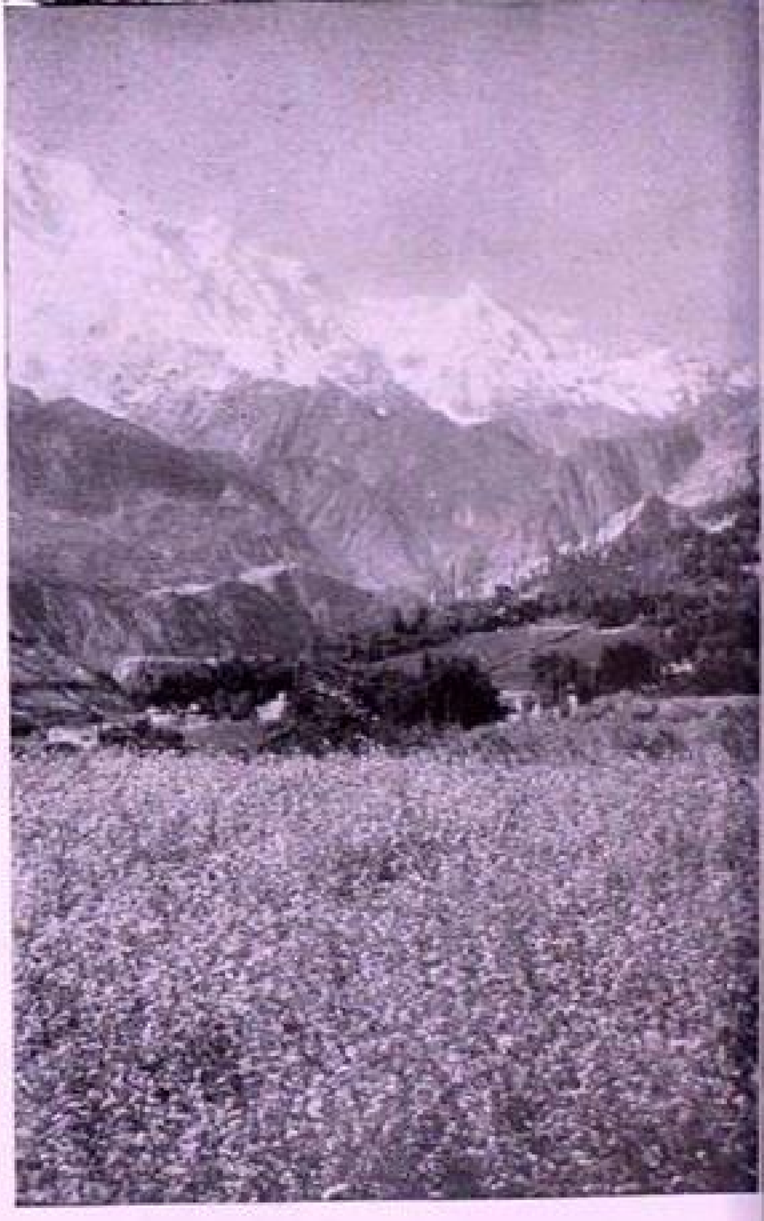
بلتستان



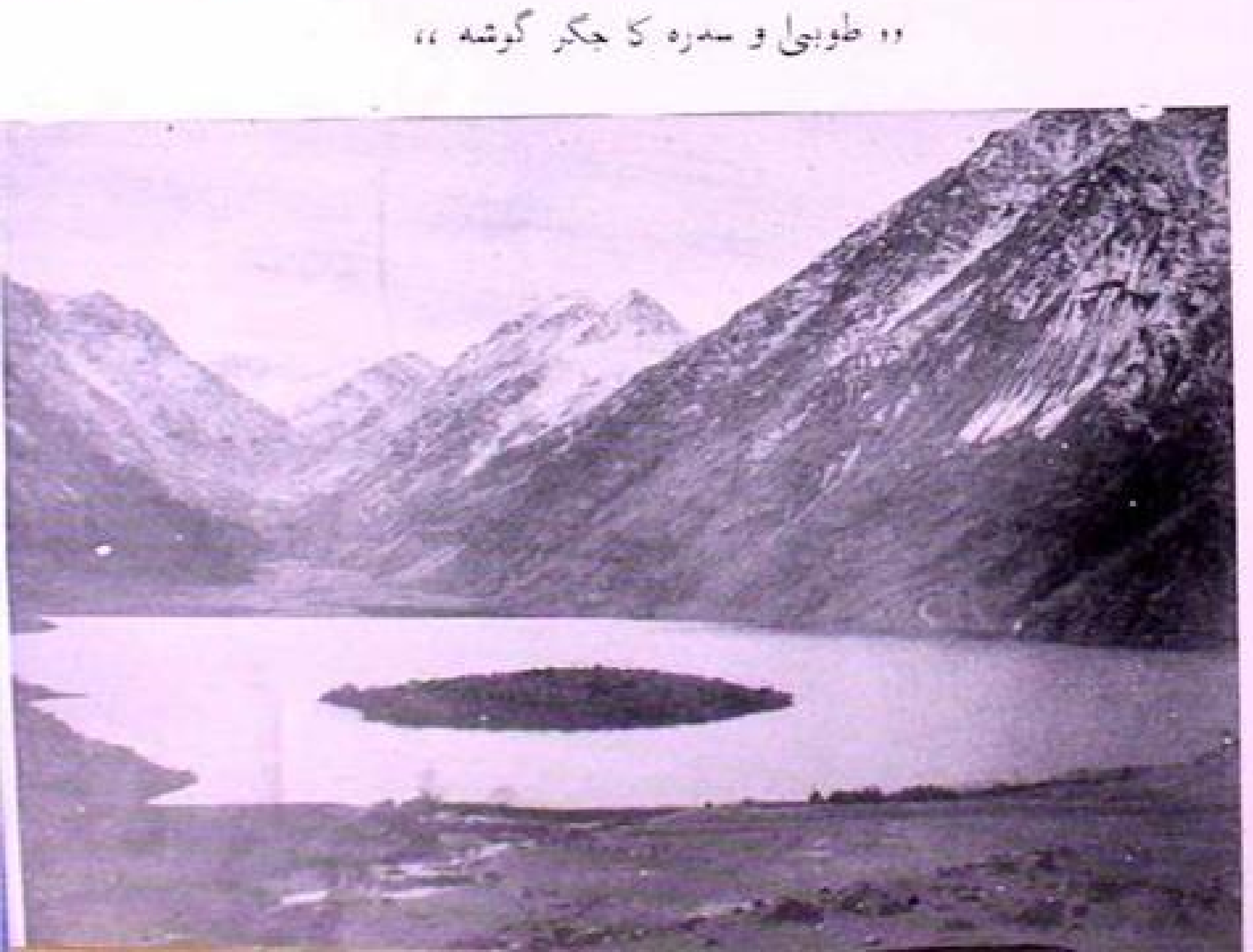
"سبزۂ نہ چمن"



"طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ"



"سبزہ زار ہائے مطرا"



"موج محیط آب"

ہماری دو نئی مطبوعات

(زیر طبع)

انتخاب "ماہ نو"

"ماہ نو" کے سلسلہ انتخابات کی تیسری ترتیب جو پچھلے پانچ سالوں کے بہترین مضامین نظم و نثر کی چیدہ اور نمائندہ تحریروں پر مشتمل ہے۔ ملک کے بہترین اہل قلم کے مضامین نظم و نثر جو ہمارے ملی ادب، تاریخ و فن، اور ثقافت و انتقاد کے موضوعات پر سیر حاصل پیشکش ہیں اور دائمی قدر و قیمت کے حامل۔

کتاب مصور اور کافی ضخیم ہوگی

اپنی کاپی کیلئے فرمائش جلد درج کرا لیجئے۔

☆

(زیر طبع)

سنہرا دیس

(وفا راشدی)

مدھر دریاؤں، گنگناتے مانجھیوں، سنہرے پٹ سن اور روپہلی دھان کی سرزمین کا ایسا مرقع جو ہمیں اس دیس سے اور قریب کر دے گا۔ جو ہمیں اس کی عظیم تاریخ، اس کے شاندار ادب، فنون اور زندگی کی جھلکیوں سے پہلی بار بطریق احسن روشناس کرائے گا۔

اپنے موضوعات کے تنوع اور اسی دھرتی کے رہنے والے کے قلم سے پر خلوص تاثرات، مستند حقائق اور معلومات پر مشتمل ایسی وقیع پیشکش جو عرصہ تک مشرقی پاکستان پر ایک نفیس دستاویزی حوالہ سمجھی جائے گی۔

— ضخیم — مصور — مجلد

فرمائش جلد درج رجسٹر کرائیں۔

ادارۂ مطبوعات پاکستان — پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا۔
مطبوعہ مشہور آفسٹ لیتھو پریس، میکلوڈ روڈ، کراچی۔ مدیر: ظفر قریشی